ڈگر پنگھٹ کی

(ڈرامے)

رفعت سروش

ڈگر پنگھٹ کی

(ڈرامے)

رفعت سروش

اشاعت اوّل: دسمبر ۱۹۹۱ء
تعداد: پانچ سو
قیمت: ساٹھ روپے
کتابت: محمد حامد بستوی
سرورق: جاوید سروش
ناشر: نورنگ کتاب گھر
۲۔ بی پاکٹ سی۔ سدھارتھ ایکسٹینشن
نئی دہلی ۱۱۰۰۱۴
مطبع: جے۔ کے آفسیٹ پریس۔ دہلی

TITLE : DAGAR PANGHAT KI (PLAYS)
AUTHOR : RS60/-
DECEMBER 1991
PUBLISHER : NAV RANG KITABGHAR
2-B POCKET C
SIDHARTH EXTENSION
NEW DELHI - 110014

ترتیب

محتاج ہے یا ہے غنی مجبور یا مختار رہے
بازی گہِ ایّام میں ہر شخص اک کردار رہے

پیش لفظ

"ڈگر پنگھٹ کی"، میرے نثری ڈراموں کا پہلا مجموعہ ہے جو اشاعت پذیر ہو رہا ہے۔ میں نے آل انڈیا ریڈیو میں ملازم ہونے کے بعد پہلا ڈرامہ اوائل ۱۹۴۶ء میں لکھا تھا اور اس کے بعد چھوٹے بڑے سیکڑوں ڈرامے اور فیچر لکھے۔ محض لکھنے کے لیے نہیں بلکہ ریڈیو پر پیش کرنے کے لیے، اس لیے اس فن سے میں بہت جلد آشنا ہو گیا تھا کہ لفظ کو ڈرامے کے لیے کیسے استعمال کرنا چاہیے۔ میں ڈراموں کا محض مصنّف ہی نہیں تھا بلکہ ان ڈراموں کو پروڈکشن کی کسوٹی پر بھی کستا تھا اور کوئی تحریری مکالمہ آواز میں ڈھل کر کیسا لگتا ہے اس کا عملی تجربہ کرتا تھا اور لفظ کی نوک پلک صوتی اعتبار سے سنوارتا تھا۔ بخاری صاحب نے یہ گر سکھایا تھا کہ ریڈیو کے لیے لفظ بول کر لکھنا چاہیے۔ میں نے اکثر ڈراموں کے مسودے محفوظ نہیں رکھے۔ یوں ہوتا تھا کہ دو تین کاربن پیپر لگا کر ڈرامہ لکھا، کاپیاں آرٹسٹوں کو دیں۔ ریہرسل ہوئی اور پھر نشر ہونے کے بعد وہ کاغذات فائل میں چلے گئے یا ردّی کی ٹوکری میں۔ روز کا کام تھا کہاں تک کاغذوں کے پلندے سنبھالتا۔ مگر اس لاپرواہی کے باوجود اب بھی بہت سے ڈراموں کے کٹے پھٹے مسودے میرے پاس ہیں جن پر بشرط فرصت نظر ثانی کرونگا۔

زیر نظر کتاب میں دو اسٹیج ڈرامے ہیں اور چار ریڈیائی ڈرامے "ڈگر پنگھٹ کی" حضرت امیر خسرو کی زندگی اور فکر و فن کا احاطہ کرتا ہے۔ یہ ڈرامہ میں نے ۱۹۸۰ء میں لکھا تھا اور ۱۹۸۱ء میں، ہم سب ڈرامہ گروپ، غالب انسٹی ٹیوٹ کے لیے خود ڈائریکٹ کیا۔ مجھے اسٹیج ڈائرکشن کا زیادہ تجربہ نہیں تھا مگر بیگم عابدہ احمد کے اصرار پر ڈائریکشن کی ذمہ داری قبول کر لی اور اس امتحان میں بھی کامیاب ہوا۔ یہ ڈرامہ بہت مقبول ہوا اور دلی اور بریلی میں کئی کئی روز تک کھیلا گیا —— "مصوّر" ایک چیتر کار کی ذہنی کش مکش کو پیش کرتا ہے۔ اور فن مصوّری کے چیستانی پہلو پر ایک طنز ہے۔ یہ بنیادی طور پر ریڈیائی ڈرامہ تھا مگر جب میں نے یہ ڈرامہ رسالہ 'آجکل' میں چھپوایا تو اسے اسٹیج ڈرامہ کے روپ میں ڈھال دیا۔

یہاں ایک ضروری بات —— ہمارے کئی مشہور و معروف افسانہ نگار آل انڈیا

ریڈیو سے متعلق رہے اور انھوں نے ریڈیو کے لیے بہت سے ڈرامے لکھے مگر جب چھپوائے تو اسٹیج ڈراموں کے طور پر۔ ان افسانہ نگاروں میں کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، اوپیندر ناتھ اشک اور شوکت تھانوی جیسے مشاہیر شامل ہیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ ریڈیائی ادب کو ایک عرصہ تک وہ اعتبار حاصل نہ ہوسکا جس کا وہ مستحق تھا گزشتہ چند سال میں جب ہمارے تعلیمی اداروں نے ذرائع ابلاغ اور الکٹرانک میڈیا کی طرف توجہ کی ہے تو ریڈیو ڈرامہ کی الگ پہچان ہونے لگی اور 'دانشورانِ کالج' کی سمجھ میں بھی یہ بات آگئی ہے کہ ریڈیائی ٹیکنیک اسٹیج سے بالکل مختلف ہے اس میں آواز کے اتار چڑھاؤ، لفظ کی ادائیگی، مائک سے نزدیکی یا دوری، صوتی اثرات، اور پس منظر کی موسیقی، بعض اوقات ان معانی اور منظر ناموں کی ترسیل کرسکتی ہے جن پر اسٹیج ڈرامہ قادر نہیں ہوتا۔ اسٹیج ڈرامہ میں ظاہری منظر، اداکاروں کے چہروں کے تاثرات، اور روشنی کی آنکھ مچولی سے جو کام لیا جاتا ہے اس کا ریڈیو ڈرامہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اس کتاب میں چار ریڈیائی ڈرامے ہیں اور میں نے انھیں اسٹیج ڈراموں میں منتقل کرنے کی غیر مستحسن کوشش نہیں کی بلکہ انھیں ضروری 'پروڈکشن کے اشاروں' کے ساتھ نذرِ قارئین کررہا ہوں۔ شاید یہ ڈرامے ریڈیائی ٹیکنیک کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوں۔ یہ ڈرامے زندگی کے مختلف پہلوؤں کو پیش کرتے ہیں "بگولے" میں 'الٹراماڈرن سوسائٹی' کی کھوکھلی زندگی کی جھلک ہے —— "ایک ڈوبتا جزیرہ" اس معاشرے میں ایک غریب مگر خوددار شاعر کی بے چارگی کو پیش کرتا ہے —— "غنچہ پھر لگا کھلنے" مرقع ہے ایک مجاہدِ آزادی کی حوصلہ مندی کا جس کا جسم بوڑھا ہوچکا ہے مگر دل میں ابھی ملک و قوم کی خدمت کا جوش ہے —— "زندگی کی طرف" کا موضوع ہے تحلیل نفسی —— شاید بعض قارئین کو یہ ڈرامہ غیر فطری نظر آئے مگر میں نے اس ڈرامے کو قلم بند کرنے سے پہلے زندگی کے اس پہلو کو تجربہ کی آنکھ سے دیکھا ہے۔

رفعت سروش
۱۰ دسمبر ۹۱ء

ڈگر پنگھٹ کی

کردار :۔

• امیر خسرو	مشہور شاعر
• والدہ	خسرو کی والدہ
• بہو	خسرو کی بیوی
• عفیفہ	خسرو کی بیٹی
• حسام الدّین قتلغ	خسرو کا چھوٹا بھائی
• شبنم	خسرو کے گھر کی ملازمہ
• جلال الدین خلجی	مشہور خلجی بادشاہ
• علاءالدین خلجی	بادشاہ
• خواجہ خطیر	وزیر دربارِ خلجی
• احمد چپ	امیر دربارِ خلجی
• حسن سجزی	خسرو کا دوست اور شاعر
• چھجو	ایک بھٹیارن
• شرفو	ایک دُھنا
• شاگرد	خسرو کے شاگرد
• رام کلی ، کلثوم ، زینب ، • کلیانی	پٹیالی گاؤں کی لڑکیاں
• جے پال	پٹیالی کا ایک کسان

• چند درباری گویے، دربان اور کچھ دوکاندار وغیرہ۔

"تمام عمر کی خدمت گزاری کا یہ انجام —— ! وہ کونسا منحوس دن تھا جب میں نے شاہی ملازمت اختیار کی تھی۔ کس کس کی مدح سرائی نہ کی، کس کس کی شان میں قصیدے نہ لکھے۔ آج اپنی اس مبالغہ آرائی اور جھوٹ کے پلندے پر شرمندہ ہوں۔ مجھ جیسے شاہی مصحف دار سے تو وہ غریب اور آزاد مزدور کہیں اچھا جو محنت مشقت کر کے اپنی روزی کماتا ہے۔ اپنی نیند سوتا ہے اور اپنے حساب سے جاگتا ہے۔ میں نے جتنی خدمت سلاطینِ دہلی کی کی اگر اتنی خدمت محبوب الٰہی کی کرتا تو میرا قلب روشن ہو چکا ہوتا۔ آج میرا ضمیر مجھ پر ملامت کر رہا ہے کہ خسرو تو نے کیا کیا۔ عمر عزیز تاج و تخت کے بھوکے شہزادوں اور بادشاہوں کی قصیدہ خوانی میں گزار دی —— افسوس"

(اس ڈرامے کا ایک اقتباس)

ڈگر پنگھٹ کی

(۱)

(پردہ اٹھتا ہے تو ایک قدیمی سرائے کا منظر نظر آتا ہے۔ چھوٹی اینٹوں کے دروازے پر مشعل جل رہی ہے، اندر ایک دو تپائیاں رکھی ہیں، ایک پرانا تخت بچھا ہوا ہے، زمین پر ملگجا سا فرش بچھا ہوا ہے۔ ایک کونے میں ایک آدمی چادر تانے لیٹا ہے جیسے بیمار یا تھکا ہوا ہو۔ سرائے کا مالک ایک موڑھے پر بیٹھا حقہ گڑگڑا رہا ہے، کچھ مسافر اپنا سامان کھول رہے ہیں اور کچھ باندھ رہے ہیں۔ ایک مسافر اپنی گٹھڑی میں سے سر پر باندھنے کا رومال نکالتا ہے)

خان (سرائے کے مالک کی طرف رخ کر کے) شیخ جی! یہ رومال آپ کے لیے (رومال دیتا ہے)

شیخ جی : (خندہ پیشانی سے رومال لیتے ہوئے) ارے خان! اس کی کیا ضرورت تھی۔ تم جب آتے ہو، میرے واسطے ایک رومال ضرور لاتے ہو۔

خان : آپ یہ نذرانہ قبول کرتے ہیں تو ہمارا دل خوش ہوتا ہے، برکت ہوتی ہے۔

(خان شیخ جی کے پاس موڑھے پر بیٹھ جاتا ہے اور وہ اسے حقہ دیتے ہیں)

شیخ : خان! تم اکیلے سفر کرتے ہو اور تمھارے ساتھ تجارت کا بہت مال ہوتا ہے۔ کوئی تکلیف! کوئی قباحت!

خان : (ہنس کر) کیسی بات کرتے ہو شیخ جی! یہ غیاث الدین بلبن کا زمانہ ہے، آپ تو دلّی میں رہتے ہیں، دلی سے باہر نکل کر دیکھیے سلطان بلبن کا کتنا رعب ہے۔ سڑک پر سونا اچھالتے چلے

جائیے۔ مجال ہے کوئی آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے۔

شیخ : ہاں یہ تو ہے۔

(خان اپنے سامان کو ٹھیک کرنے لگتا ہے ___ کونے میں کچھ لوگ طبلہ اور تنبورہ لیے لیے بیٹھے ہیں)

شیخ : (حقہ گڑگڑاتے ہوئے) ارے سیتا! اب تک بیراگی اور سیلانی نہیں آئے۔

بیراگی : (تنبورہ کا تار چھیڑتے ہوئے) شیخ جی! ہم تو کب کے آ گئے۔

شیخ : (ہنس کر۔ اپنی داڑھی کے بال مروڑتے ہوئے) ہمیں کیا پتہ کچھ سناؤ تو جانیں۔

بیراگی : بہت اچھا ___ آج ایک نئی چیز لایا ہوں آپ کے لیے۔

شیخ : سبحان اللہ۔

(بیراگی اور سیلانی اور ان کے ایک دو اور ساتھی اپنے ساز سنبھالتے ہیں۔ پہلے دھن بجاتے ہیں اور پھر قوالی کے بول گاتے ہیں)

بہت کٹھن ہے ڈگر پنگھٹ کی

شیخ جی: سبحان اللہ! واہ واہ۔

(قوالی گائی جا رہی ہے، سرائے کے لوگوں پر ایک کیفیت طاری ہوتی جا رہی ہے ایک شکستہ حال مسافر سرائے میں داخل ہوتا ہے اور ایک کونے میں بیٹھ کر قوالی سننے لگتا ہے۔ گانے والوں کی نگاہیں بار بار اس شخص کی طرف اٹھ جاتی ہیں۔ قوالی ختم ہوتی ہے تو سب واہ واہ کرتے ہیں ___ تھکا ہارا مسافر جو خسرو ہے، قوالوں سے پوچھتا ہے)

خسرو : آپ لوگ کس کا کلام گا رہے تھے۔

بیراگی : یہ امیر خسرو کا کلام تھا۔

خسرو : خسرو!

بیراگی : جی ہاں۔ اچھا شاعر تھا بے چارہ۔ آفت کا مارا دلی سے ملتان چلا گیا تھا۔ سنا ہے وہاں شہزادے کے ساتھ اس پر بھی مصیبت نازل ہوئی۔ اب مدت سے لاپتہ ہے۔ معلوم نہیں جنگ میں کام آ گیا یا کہیں مر کھپ گیا۔

شیخ جی : آپ کون ہیں۔ کہاں سے آئے ہیں۔

خسرو : میں ۔!! میں تو ایک بھٹکا ہوا مسافر ہوں، کہاں سے آیا ہوں، کہاں جانا ہے، یہ مجھے خود بھی معلوم نہیں۔

بیراگی : (ہنس کر) ارے واہ! تم تو فلسفی معلوم ہوتے ہو۔

خسرو : من آنم کہ من دانم۔

بیراگی : رات یہیں گزارو گے۔

خسرو : نہیں، میں تو ادھر سے گزر رہا تھا۔ تمھارے گانے کی آواز سنی تو قدم خود بخود ادھر کو اٹھ گئے۔

شیخ جی : ارے اب آ گئے ہو تو ٹھیرو، کہاں جاؤ گے رات کو۔

خسرو : (اٹھتے ہوئے) جہاں قسمت لے جائے

(خسرو جاتا ہے)

بیراگی : ارے سن سیلانی! ہو نہ ہو یہ خسرو ہیں۔

سیلانی : (ہنس کر) ارے کیا بات کرتے ہو ــــــ یہ اور خسرو! وہ تو امیر خسرو ہیں، بانکے سجیلے ــــــ کیا میں نے انھیں حضرت نظام الدین کی خانقاہ میں نہیں دیکھا۔

بیراگی : دیکھا تو میں نے بھی ہے ــــــ مگر....

سیلانی : چل چل۔ اب بستر بچھا اور سو جا۔

(دونوں اپنے اپنے بستر بچھانے لگتے ہیں۔ شیخ جی حقہ گڑگڑا رہے ہیں ــــــ اسٹیج کی روشنیاں آہستہ آہستہ گل ہو جاتی ہیں)

●

(۲)

(پردہ اٹھتا ہے تو دہلی میں خسرو کا گھر نظر آتا ہے۔ نہایت سلیقے سے ہر چیز رکھی ہوئی ہے، ایک تخت پر عمدہ چادر بچھی ہوئی ہے، گاؤ تکیے لگے ہوئے ہیں، ادھر ادھر ایک دو پیڑھے بھی رکھے ہوئے ہیں۔ ایک کارنس پر کچھ کتابیں بھی رکھی ہیں۔ اسٹیج کے بائیں جانب نماز کی چوکی بچھی ہوئی ہے۔ خسرو کی والدہ مصروفِ نماز ہیں۔ خسرو کی بیوی کارنس پر کوئی چیز اٹھا کر اسے اور سلیقے سے رکھتی ہیں ——— اسٹیج پر ایک عقبی دروازہ بھی ہے ——— خسرو کی بیوی کے چہرے پر دکھ کے آثار ہیں۔ والدہ سلام پھیر کر دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتی ہیں)

والدہ: اے خدا! تو مجھ دکھیا کی فریاد سن لے۔ میرے بچے کو ظالموں کے جنگل سے نجات دلا۔ وہ ساتھ خیریت کے گھر آئے۔ اپنے حبیب پاک کے صدقے میں خسرو کی تمام مشکلیں آسان کر۔ اس کی مرادیں پوری کر۔ تو بڑا رحیم ہے، کریم ہے۔ میں تیری گناہگار بندی، بس تیرے کرم پر بھروسہ ہے (والدہ آبدیدہ ہے، آواز میں رقت ہے۔ دعا مانگ کر منہ پر ہاتھ پھیرتی ہے، پھر نظر اٹھا کر دیکھتی ہے کہ بہو کھوئی کھوئی سی کارنس سے ٹیک لگائے کھڑی ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو ہیں)

والدہ: بہو! تم رو رہی ہو ——— خدا پر بھروسہ رکھو۔ وہ اپنے نیک بندوں کی ضرور سنتا ہے۔

بہو: اماں! میں کیا کروں۔ آنسو تو خود بخود آنکھوں میں آجاتے ہیں۔ نہ جانے وہ کس حال میں ہوں گے۔

والدہ: میرا دل کہتا ہے وہ خیریت سے ہے۔

بہو : خدا کرے

والدہ : (نماز کی چوکی سے اٹھ کر کمر سیدھی کر کے کھڑی ہوتی ہے۔ اور ایک دو قدم چلتی ہے) منگول لٹیروں کے چنگل میں پھنس گیا میرا بچہ۔ خدا غارت کرے ان منگولوں کو۔ دنیا پر قہرِ خداوندی کی طرح ٹوٹ پڑے ہیں۔ نہ جانے ہمارے کن گناہوں کی سزا ہے۔

بہو : میں تو کہتی ہوں اللہ کی لاٹھی میں آواز نہیں۔ بے گناہوں کو ستانے والا ایک نہ ایک دن ضرور سزا بھگتے گا۔ ہتھیاروں کو سزا مل کے رہتی ہے۔

والدہ : ہاں جیت تو سچائی کی ہوتی ہے، مگر اس جنگ بازی میں مارے تو جاتے ہیں بے گناہ۔ کتنے گھر بے چراغ ہو جاتے ہیں۔

بہو : ہاں اس میں کیا شک ہے۔

والدہ : (اپنے آپ کو سنبھالتی ہوئی پیڑھے پر بیٹھ جاتی ہے) بہو! تم نے کچھ کھایا۔

بہو : نہیں اماں! میں آپ کے بغیر کچھ نہیں کھاؤں گی ——— آئیے۔ اٹھیے۔ کتنی کمزور ہو گئی ہیں آپ۔

والدہ :۔ (اٹھتے ہوئے) میرا خسرو آجائے گا تو میں چار دن میں ٹھیک ہو جاؤں گی۔

(کوئی زور زور باہر کا دروازہ پیٹتا ہے)

والدہ :۔ اری بہو! دیکھ تو کون ہے۔

(دروازہ پھر پیٹا جاتا ہے)

بہو :۔ اماں وہی ہوگا گونگا فقیر ———

والدہ :۔ تو اسے کچھ دیدے۔

بہو :۔ اری شبنم! فقیر کو ایک پیالہ آٹا دیدے۔

شبنم :۔ اچھا ——— بیگم صاحبہ

(ایک مٹکی میں سے پیالہ بھر آٹا نکالتی ہے اور فقیر کو دینے کے لیے آگے بڑھ کر دروازہ کھولتی ہے ——— خسرو شکستہ حال، لباس تار تار ——— بھوک پیاس سے نڈھال دروازہ کھلتے ہی سر نیوڑھائے اندر گھستا ہے)

شبنم :۔ ہائے اللہ ——— خسرو جی، کیا ہو گیا آپ کو۔

(حیرت اور صدمے سے شبنم کے ہاتھ سے آٹے کا پیالہ چھوٹ جاتا ہے) ہائے اللہ۔

بہو :۔ (دوڑ کر دروازے پر جاتی ہے) آپ! ـــــ یہ کیا حال ہو گیا ہے آپ کا۔

(دوڑی دوڑی ماں کی طرف بڑھتی ہے۔ گھبراہٹ میں اس کے منہ سے کچھ نہیں نکلتا ہے پھر چیختی ہے۔)

اماں ـــــ اماں ـــــ یہ ـــــ یہ

خسرو :۔ پانی ـــــ (بہو جلدی سے پانی پلاتی ہے)

ماں :۔ (کچھ دیر حیرت زدہ دیکھتی رہتی ہے) خسرو بیٹا! تم ـــــ تمہارا یہ حال،

خسرو :۔ (پانی پی کر نڈھال چوکی پر بیٹھ جاتا ہے ڈھلکا ہوا اور ٹکر ٹکر اِدھر اُدھر دیکھ رہا ہے) مجھے یقین نہیں آرہا ہے کہ میں اپنے گھر آگیا ہوں۔

والدہ :۔ (دلاسہ دیتے ہوئے) بیٹا! تم اپنے گھر میں ہو، اپنی ماں کے پاس۔

(بہو اتنی دیر میں تخت پر چادر وغیرہ لگاتی ہے)

بہو :۔ آپ بہت تھکے ہوئے ہیں۔ لیٹ جائیے۔

(خسرو کے چہرہ پر آہستہ آہستہ بحالی آتی ہے اور وہ پلنگ پر لیٹ جاتا ہے۔ ایک منٹ تک آنکھیں بند رکھتا ہے ـــــ پھر کھولتا ہے اور ماں اور بیوی اور گھر کے در و دیوار کو دیکھتا ہے)

والدہ :۔ تیری طبیعت تو ٹھیک ہے

خسرو :۔ ٹھیک ہوں ـــــ اب تو سب کچھ ٹھیک ہے۔ بچے کیسے ہیں، نظر نہیں آرہے ہیں۔

(خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتا ہے)

والدہ :۔ سب ٹھیک ہیں۔ باہر کھیل رہے ہوں گے ـــــ تو آرام کر۔

خسرو :۔ (کچھ مسکرا کر) اب تو آرام ہی آرام ہے۔

والدہ :۔ اچھا تو جاؤ منہ ہاتھ دھو۔ لباس تبدیل کرو۔ جاؤ بہو اس کے کپڑے نکال دو۔ (بہو اور خسرو اندر کے کمرے میں جاتے ہیں)

والدہ :۔ کیا حال ہو گیا ہے میرے بچے کا ـــــ اری شبنم! کھانا لگاؤ۔ بچہ بھوکا ہے جانے کب سے۔

شبنم :۔ بس بیگم صاحبہ! کھانا تیار ہے۔

اللہ تیرا شکر ہے تو اسے ہر آفت سے بچانا۔

(خسرو اندر کے کمرے سے آتا ہے لباس بدل کر)

والدہ:۔ اب بتاؤ بیٹا! تم کہاں سے آ رہے ہو ـــــ نہ کوئی سامان، نہ کوئی سواری۔

خسرو:۔ اماں! میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ زندہ سلامت یہاں تک آ گیا۔ پیر و مرشد نظام الدین اولیاء کی محبت کا سایہ ہر وقت میرے سر پر رہا۔ ورنہ میرے لیے ہر طرف موت ہی موت تھی۔

والدہ:۔ آخر ہوا کیا ـــــ سنا تھا کہ شہزادہ محمد منگولوں سے ہار گیا۔

خسرو:۔ (جوش میں اٹھ کر) ہارا ہی نہیں ـــــ مارا گیا ـــــ وہ منظر اب تک میری نظروں میں گھوم رہا ہے۔ (خسرو کے چہرے پر وحشت سی برسنے لگی ہے۔)

والدہ:۔ اچھا چھوڑ وہاں کی باتیں ـــــ بھول جا سب کچھ۔

خسرو:۔ کیسے بھول جاؤں ـــــ کیسے بھول جاؤں۔ میں نہ جانے کتنے دن کی مسافت طے کر کے ـــــ گرتا پڑتا یہاں تک پہنچا ہوں۔ اور ـــــ اور ـــــ اب اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا ہوں۔

والدہ:۔ اچھا میں سب کچھ سنوں گی۔

(بہو ایک طشت میں کھانا لے کر آتی ہے۔ خسرو کے ہاتھ دھلاتی ہے۔ اور وہ بسم اللہ کر کے ایک نوالہ منہ میں رکھتا ہے)

خسرو:۔ خدا کا شکر ـــــ کتنے دن بعد کھانا نصیب ہوا ہے، اور وہ بھی گھر کا کھانا۔ (بہو خسرو کے پاس بیٹھ کر پنکھا جھلتی رہتی ہے۔)

خسرو:۔ بس۔ پانی پلاؤ ـــــ اور بھوک نہیں ہے۔

بہو:۔ آپ نے تو کچھ بھی نہیں کھایا۔

خسرو:۔ (ہنس کر) سیر ہو کر کھایا۔

بہو:۔ شبنم یہ کھانا بڑھاؤ (شبنم کھانے کے برتن اٹھاتی ہے)

خسرو:۔ اماں خدا بڑا رحیم و کریم ہے ـــــ میری جان بچائی۔ اور میں آپ کی قدم بوسی کے لیے دلّی تک آ گیا۔ اب گھر سے نکلوں گا تو سب سے پہلے پیر و مرشد کی خدمت میں حاضری دوں گا۔ اماں! دعا مانگو کہ اب مجھے آپ سے الگ نہ رہنا پڑے۔

والدہ:۔ اچھا اب آرام سے بیٹھ اور وہاں کی باتیں سنا۔ مجھے تو نہ دن کو چین تھا نہ رات کو نیند۔ ہر وقت تیرا ہی فراق تھا کہ نہ جانے میرا بچہ کہاں ہوگا۔

(بہو باتیں سننے کے لیے دروازے سے لگ کر کھڑی ہو جاتی ہے)

خسرو :۔ اماں بس کیا بتاؤں۔ یہ سمجھیے کہ ایک قیامت سے گزر کر آیا ہوں۔

والدہ :۔ مگر شہزادہ سلطان محمد ہارا کیسے؟

خسرو :۔ ہارا ہی نہیں، جنگ میں مارا گیا۔ شہید ہوا۔

والدہ :۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

خسرو :۔ بہت دردناک کہانی ہے۔ شہزادہ ملتان میں تھا کہ اسے منگولوں کے حملہ کی خبر ملی۔

بہو :۔ آپ بھی وہیں تھے۔

خسرو :۔ ہاں۔

والدہ :۔ ارے بہو کھڑی کیوں ہو۔ بیٹھ جاؤ۔ (بہو پیڑھے پر بیٹھ جاتی ہے)

خسرو :۔ منگول سپہ سالار تیس ہزار فوج لے کر آ چڑھا تھا۔ مگر شہزادے نے سمجھا تین ہزار اور اسی حساب سے اپنی فوج لے کر مقابلے کے لیے بڑھا۔

بہو :۔ آپ بھی ساتھ گئے۔

خسرو :۔ ہاں ____ منگولوں نے اتنی مہلت نہ دی کہ ہم لوگ اور فوجیں بلوا سکیں۔ لاہور کے قریب مقابلہ ہوا۔ وہ درندے دوپہر کو دریا پار کر کے مٹھی بھر فوج پر ٹوٹ پڑے۔

بہو :۔ کم بخت کہیں کے۔

(خسرو قدرے توقف کرتا ہے اور اٹھ کر اسٹیج پر ایک دو قدم چلتا ہے)

خسرو :۔ ہماری فوج نے بہادری سے مقابلہ کیا اور حملہ آور کو پسپا کر دیا ____ مگر جب ہم لوگ نماز پڑھ رہے تھے تو منگولوں نے بے خبری میں پھر حملہ کر دیا۔ شہزادہ بے جگری سے لڑا اور شہید ہو گیا۔ فوج میں ابتری پھیل گئی۔ دشمن نے موقع کا فائدہ اٹھایا اور خون کے دریا بہا دیے اور زمین کو لاشوں سے پاٹ دیا۔

والدہ :۔ (ہاتھ بلند کرتے ہوئے) اللہ تیری اماں۔ تو نے میرے بچے کی جان بچائی۔

خسرو :۔ اماں وہ منظر بھلائے نہیں بھولتا ____ منگول سپاہیوں نے قیدیوں کی گردنوں کو اس طرح باندھ دیا جیسے لڑی میں پھول پرو رہے ہوں۔

بہو :۔ اور انھیں قیدیوں میں آپ بھی تھے۔

خسرو :۔ ہاں ____ پیاس سے میری زبان خشک ہو گئی تھی۔ میرا لباس تار تار کر دیا گیا اور ایک منگول سپاہی گھوڑے پر سوار ____ مجھے رسی سے گھسیٹتا ہوا بڑھا جا رہا تھا۔

والدہ :۔ بدبخت۔

خسرو :۔ میرے سامنے موت ناچ رہی تھی۔

والدہ :۔ مریں تیرے دشمن۔

خسرو :۔ خدا کا کرنا کیا ہوا کہ اس افسر کو پیاس لگی سامنے دریا تھا۔ وہ منگول اور اس کا گھوڑا پانی پر ٹوٹ پڑے اور اتنا پانی پیا۔ اتنا پانی پیا کہ وہیں ڈھیر ہو گئے۔

بہو :۔ خس کم جہان پاک۔

خسرو :۔ میں نے احتیاط برتی۔ تھوڑا سا پانی پیا اور دشمنوں کے نرغے سے اکیلا بھاگ نکلا۔

والدہ :۔ اللہ تیرا شکر۔ تیرے ساتھ تیری ماں کی دعائیں اور نیکیاں تھیں۔ اور حضرت نظام الدین اولیاء جیسے بزرگوں کا سایہ تیرے سر پر تھا اور اللہ کی رحمت تیری محافظ۔ پھر کیسے تیرا بال بیکا ہو سکتا تھا ــــ اللہ نے میری دعا اور تیرے بیوی بچوں کی فریاد سن لی۔

بہو :۔ اے اللہ! تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔

خسرو :۔ اماں! سنا ہے شہزادہ سلطان محمد کی موت کا بادشاہ بلبن پر کافی اثر ہے اور ان کی حالت اچھی نہیں ہے۔

والدہ :۔ ہاں، بادشاہ کی علالت سے رعایا بھی پریشان ہے۔

خسرو :۔ میری خواہش تو یہ ہے کہ شاہی دربار سے وابستہ ہو جاؤں، دلی ہی میں رہوں جہاں آپ کی شفقت کا سایہ نصیب رہے اور پیر و مرشد محبوب الٰہی کے قدموں میں بیٹھنے کا شرف حاصل رہے ــــ مگر . . . .

والدہ :۔ مگر کیا۔!

خسرو :۔ مگر بدخصلت اور کینہ پرور کوتوال نظام الملک کی وجہ سے میں فی الحال شاہی دربار کی مسموم فضا سے دور رہنا چاہتا ہوں۔ میں ریشہ دوانیوں کا شکار نہیں بننا چاہتا۔ جہاں عزتِ نفس نہ ہو وہاں میں ایک منٹ بھی نہیں رہ سکتا۔

والدہ :۔ بالکل درست ــــ تو پھر اب کیا ارادہ ہے

خسرو :۔ اگر آپ اجازت دیں تو کچھ دن کے لیے دارالسلطنت کی مسموم فضا سے دور ــــ پٹیالی چلا جاؤں۔

والدہ :۔ ارے بیٹے ابھی تو آئے ہو اور ابھی جانے کی بات سوچنے لگے۔ کچھ دن آرام سے رہو اپنی ماں کے پاس۔

خسرو :- آپ کے قدموں میں تو میرا دل ہمیشہ سر بسجود رہے گا۔ میں دلی میں رہوں یا دلی سے باہر۔

(ماں شفقت سے خسرو کے سر پر ہاتھ پھیرتی ہے۔ وہ نیاز مندی سے جھکا ہوا ہے۔ بہو بھی دروازے کے پاس آکھڑی ہو گئی ہے۔)

خسرو :- (بہو پر نظر) اماں زندگی کی راہ اتنی آسان نہیں جتنی نظر آتی ہے۔ بہت کٹھن ہے ڈگر پنگھٹ کی۔

والدہ :- اور اسی لیے ثابت قدمی سے چلنا ضروری ہے۔

(اسٹیج کی روشنیاں گل ہو جاتی ہیں)

●

(۳)

(اسٹیج پر روشنی ہوتی ہے تو پٹیالی گاؤں کا منظر نظر آتا ہے، پس منظر میں درخت، دائیں طرف ایک جھولا پڑا ہے۔ اور بائیں طرف ایک کنواں ہے کنویں پر ایک عورت پانی بھر رہی ہے۔ ڈول کھینچتی ہے اور پھر اپنا گھڑا بھر کرلے جاتی ہے ــــــ کچھ گھڑے اور ڈول کنویں کے من پر رکھے ہیں۔ جھولے پر کچھ لڑکیاں جھول رہی ہیں اور خسرو کا گیت گا رہی ہیں۔ دو جھولے پر ہیں اور ایک ــــــ جھلا رہی ہے)

اماں میرے باوا کو بھیجو جی کہ ساون آیا

بیٹی تیرا باوا تو بڈھاری	کہ ساون آیا
اماں میرے بھائی کو بھیجو جی	کہ ساون آیا
بیٹی تیرا بھائی تو بالاری	کہ ساون آیا
اماں میرے ماموں کو بھیجو جی	کہ ساون آیا
بیٹی تیرا ماموں تو بانکاری	کہ ساون آیا

(گیت گاکر لڑکیاں جھولے سے اترتی ہیں تو تیسری لڑکی کہتی ہے)

رام کلی :۔ اب میری باری۔

کلثوم :۔ نہیں رام کلی، اب کل جھولیں گے۔

زینب :۔ ہاں ہاں۔ چلو پانی بھر لیں، پھر دیر ہو جائے گی۔

(تینوں لڑکیاں دائیں طرف کے دروازے سے باہر چلی جاتی ہیں۔ اسٹیج کے

بائیں طرف کنویں کے پاس کچھ لڑکیاں پہلے سے موجود ہیں اور ان کی ہنسی ٹھٹھے کی آوازیں ابھرتی ہیں ــــــ اس بیچ جھولا گیت گانے والی لڑکیاں بھی بائیں دروازے سے پنگھٹ پر ہنستی ہوئی پہنچ جاتی ہیں)

کلیانی :۔ لو رام کلی کلثوم اور زینب بھی آگئیں ــــــ اری رام کلی تجھے تو خسرو کی کہ مکرنیاں خوب یاد ہیں۔

رام کلی :۔ ہاں، سن ــــ سگری رین ....

کلیانی :۔ نا ــــ یوں نہیں سنیں گے۔ تو بھاؤ کر کے سنا۔

رام کلی :۔ تو تو گھڑے پر تال دے گی۔

کلیانی :۔ منظور۔

(رام کلی کھڑی ہو کر بھاؤ کے ساتھ کہ مکرنی سناتی ہے۔ اور کلیانی تان دیتی ہے زینب بھی اس کا ساتھ دیتی ہے)

کلیانی :۔ سگری رین موہے سنگ جاگا
بھور بھئی تو بچھڑن لاگا
اس کے بچھڑے پھاٹت ہیا

زینب :۔ اے سکھی ساجن!

رام کلی :۔ نا سکھی دیا

(سب ہنستی ہیں ۔ رام کلی بیٹھ جاتی ہے تو زینب اٹھتی ہے)

زینب :۔ سرب سلونا، سب گن نیکا
وا بن سب جگ لاگے پھیکا
وا کے سر پر ہووے کون

رام کلی :۔ اے سکھی ساجن!

زینب :۔ . . . نا سکھی لون

(سب ہنستی ہیں)

کلثوم :۔ وہ آوے تب شادی ہووے
اس بن دوجا اور نہ کوئے
میٹھے لاگیں وا کے بول

زینب :۔ اے سکھی ساجن!

خسرو :۔ (دور سے آواز) نا سکھی ڈھول

(سب ہنستے ہنستے ایک دم رک جاتے ہیں)

رام کلی :۔ ارے یہ کون بولا۔

خسرو :۔ (سامنے آکر) جس نے لکھا وہی بولا۔

زینب :۔ ارے یہی تو امیر خسرو ہیں۔

کلثوم :۔ تجھے کیسے معلوم۔

زینب :۔ مجھے معلوم ہے۔ میں نے انھیں اپنے بھائی کے پاس آتے جاتے دیکھا ہے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ امیر خسرو تبدیلِ آب و ہوا کے لیے پٹیالی آئے ہوئے ہیں۔

خسرو :۔ ہاں ٹھیک ہے ___ مگر میں یہاں رنگ میں بھنگ کرنے نہیں آیا۔ ادھر سے گزر رہا تھا۔ پیاس لگی اس لیے پنگھٹ پر چلا آیا۔

کلثوم :۔ (شوخی سے) پانی تو ہم آپ کو پلا سکتے ہیں، مگر ایک شرط پر۔

خسرو :۔ پانی کے لیے بھی شرط ___ خیر ___ بولو۔

کلثوم :۔ سنا ہے آپ بڑے حاضر دماغ ہیں اور حاضر جواب بھی چٹکی بجاتے کویتا لکھ دیتے ہیں۔

خسرو :۔ ہاں، تم نے غلط نہیں سنا۔

کلثوم :۔ تو شرط یہ ہے کہ ایک ایسا دوہا لکھیے جس میں کھیر، چرخا، کتا اور ڈھول ___ چاروں شبد آجائیں۔

خسرو :۔ یہ کونسی بڑی بات ہے۔ تم کنویں میں ڈول ڈالو۔ میں تمھیں کبت سناتا ہوں،
(کلثوم کنویں میں ڈول ڈالتی ہے۔ دوسری لڑکیاں بھی آس پاس کھڑی ہو جاتی ہیں)

خسرو :۔ سنو ___ کھیر پکائی جتن سے اور چرخا دیا چلا
آیا کتا کھا گیا، تو بیٹھی ڈھول بجا ___ لا پانی پلا۔

لڑکیاں :۔ واہ واہ ___ مان گئے خسرو جی

(لڑکیوں کے چہروں پر خوشی اور خسرو کی عزت کے تاثرات کھیلنے لگتے ہیں۔ ڈول کھینچ کر خسرو کو پانی پلایا جاتا ہے۔ اور وہ اپنے گھڑے بھی بھرتی ہیں)

خسرو :۔ اچھا تم سب اپنے آپ کو ہشیار سمجھتی ہو۔
زینب :۔ ہشیار نہیں تو بدھو بھی نہیں۔

(سب دبی دبی ہنسی ہنستی ہیں)

خسرو :۔ اچھا ہماری پہیلیاں بوجھو تو جانیں
کلثوم :۔ پوچھیے۔
خسرو :۔ تر ور سے اک تریا اتری، اس نے بہت رجھایا
باپ کا اس کے نام جو پوچھا، آدھا نام بتایا
آدھا نام پتا پر پیارا بوجھ پہیلی موری
امیر خسرو یوں کہیں، اپنا نام نبولی
زینب :۔ (کچھ سوچتے ہوئے) اتا پتہ بتائیے۔
خسرو :۔ اسی میں موجود ہے۔
کلیانی :۔ (دماغ پر زور ڈالتے ہوئے) آدھا ــــ پتا پر ــــ اونہہ
خسرو :۔ ہار گئیں ــــ یہ ہے نبولی
سب :۔ واہ ــــ مان گئے۔
خسرو :۔ ایک پہیلی اور بتاؤ ــــ بہت آسان ہے
زینب :۔ پوچھیے۔
خسرو :۔ فارسی بولے آئینہ ترکی سوچے پائے نا
ہندی بولے آرسی آئے منہ دیکھو جو اسے بتائے
زینب :۔ اتا پتہ؟
خسرو :۔ تم سب کے گھر میں ہے۔ اور اس گیت میں بھی ہے۔
کلثوم :۔ (سوچتے ہوئے) آرسی ــــ منہ دیکھو ــــ (زور سے) آئینہ
خسرو :۔ بالکل ٹھیک ــــ یہ پٹیالی کی دھرتی کا اثر ہے۔
کلیانی :۔ بالکل۔ آپ یہاں پہیلی جوڑ سکتے ہیں تو کیا ہم پہیلی بوجھ بھی نہیں سکتے۔
خسرو :۔ اچھا۔ چلو مان لیا۔ تم سب بہت ہشیار ہو۔

(خسرو یہ کہتے ہوئے ان لڑکیوں سے دور چلے جاتے ہیں اسٹیج کے داہنی طرف

جیسے کچھ سوچ رہے ہوں۔)

کلثوم :۔ سچ مچ مزا آگیا امیر خسرو کے آجانے سے۔

کلیانی :۔ کتنے زندہ دل ہیں ____ مجھے تو ایسا لگا جیسے میرا بھائی آیا ہے۔

زینب :۔ اور کیا، ارے ہم سب سگے بھندھی ہی تو ہیں۔ ہم سب اندر دھنش کے رنگوں کی طرح ہیں۔

کلثوم :۔ اچھا اب تو شاعری مت بگھار۔ دیر ہو رہی ہے گھر چلو ____

(سب لڑکیاں ہنستی ہوئی اپنے اپنے گھڑے اٹھا کر اسٹیج سے باہر چلی جاتی ہیں

خسرو اسٹیج کے بیچ میں آکر اِدھر اُدھر نظر ڈالتے ہوئے)

خسرو :۔ کیا جگہ ہے پٹیالی بھی۔ ہر طرف رنگ اور نور کی برسات۔ خلوص، سادگی۔ ہنسی، چہلیں، قہقہے جیسے یہاں کے لوگوں کو کسی بات کی فکر ہی نہیں اپنی رنگ رلیوں کے سوا دن کو سیر سپاٹے، رات کو عیش۔ چین کی نیند ____ کیا جگہ ہے۔ مگر ____ مگر کوئی باعمل آدمی ایسے مقام پر کتنے دن رہ سکتا ہے ____ زندگی کے اور تقاضے بھی تو ہیں، زندگی آدمی سے بہت کچھ مطالبہ کرتی ہے ____ ملتان سے دلی ____ دلی سے پٹیالی ____ اب نہ جانے اور کہاں لے جائے یہ زندگی۔

(اسٹیج پر لمبے لمبے قدم رکھتا ہوا اور سوچتا ہوا اِدھر سے اُدھر جاتا ہے)

جے پال :۔ (دبے قدموں سے داخل ہوتا ہے) خسرو جی!

خسرو :۔ (پلٹ کر دیکھتا ہے) جی۔

جے پال :۔ آپ تو مجھے نہیں جانتے۔ مگر آپ کو میں ہی کیا، پوری پٹیالی جانتی ہے۔ آپ کے گیت اور کبت پٹیالی کے بچے بچے کی زبان پر ہیں۔

خسرو :۔ اگر میں غلطی نہیں کر رہا ہوں تو آپ جے پال ہیں۔

جے پال :۔ (خوشی سے) جی ہاں ____ جی ہاں۔ بہت یاد رکھا آپ نے۔

خسرو :۔ پٹیالی بہت دن بعد آیا ہوں۔ مگر یہاں کی فضا اور یہاں کے لوگوں کو کیسے بھول سکتا ہوں۔

جے پال :۔ ہمارا سو بھاگیہ کہ آپ یہاں آئے۔ ویسے تو چھوٹا منہ بڑی بات ہو گی۔ آج میری بیٹی کا بیاہ ہے۔ اگر آپ اس موقع پر تھوڑی دیر کے لیے ہمارے گھر آسکیں تو ہمارے بھاگ جاگ اٹھیں گے۔

خسرو :۔ یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ جے پال جی۔ میں ضرور آؤں گا۔

جے پال :۔ میں آپ کو لینے آجاؤں گا۔

خسرو :۔ نہیں اس تکلف کی ضرورت نہیں۔ اگر مجھے ٹھیک یاد ہے تو حلوائی والی گلی کے نکڑ پر ہی آپ کا گھر ہے۔

جے پال :۔ جی جی ہاں ــــــ (چلتے چلتے) تو میں راہ دیکھوں گا آپ کی۔

خسرو :۔ میں ضرور آؤں گا۔

(پہلے ایک دروازے سے جے پال جاتا ہے، پھر دوسرے دروازے سے خسرو باہر چلے جاتے ہیں ــــــ اسٹیج پر ذرا اندھیرا ہوتا ہے تو پنگھٹ کا منظر اور جھولا ہٹا دیا جاتا ہے۔ اور کچھ لوگ اِدھر اُدھر باتیں کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، اور اسٹیج کے بیچوں بیچ لڑکیاں گیت گا رہی ہیں۔ خسرو داخل ہوتے ہیں، انھیں ایک موڑھے پر بٹھا دیا جاتا ہے، مگر وہ لوگوں سے بے تکلفی اور اپنائیت کے ساتھ ملنا جلنا ہی پسند کرتے ہیں۔ دیگر لوگوں کی آوازیں نہیں آتیں۔ صرف ان کی حرکات و سکنات سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ ایک دوسرے سے مل جل رہے ہیں۔ اور لڑکیوں کا گیت فضا میں گونجتا ہے۔ لڑکیاں وہی ہیں جو پنگھٹ پر تھیں ــــــ دلھن کی ڈولی جاتی ہوئی دکھائی جاتی ہے اور بدائی کا پُرسوز منظر ہے)

گیت

سب لڑکیاں :۔ کاہے کو بیاہی بدیس رے لکھی بابُل مورے
بھائیوں کو دینو محل دو محلے ہم کو دیا پردیس مورے
لکھی بابُل مورے
ہم تورے انگنا کی بھولی رے چریاں
چگیں، پئیں، اڑ جائیں رے۔ لکھی بابُل مورے
طاق بھری میں نے گڑیاں جو چھوڑیں
چھوٹا سکھ کا ساتھ رے
لکھی بابل مورے
ہم تیرے کھونٹے کی بھولی رے گئیاں
ہانکے جدھر ہنک جائیں رے
لکھی بابُل مورے

ہم تورے بابل بیلے کی کلیاں۔
گھر گھر مانگیں جائیں رے
کاہے کو بیاہی بدیس رے لکھی بابل مورے

(گیت ختم ہوتا ہے تو اسٹیج پر وہی رونق ہے۔ روشنیاں آہستہ آہستہ گل ہو جاتی ہیں)

●

(۴)

(اسٹیج پر روشنی ہوتی ہے تو امیر خسرو کا گھر نظر آتا ہے۔ پہلے کی بہ نسبت نفاست زیادہ ہے۔ پیچھے ایک محراب ہے۔ فرش پر چاندنی اور گاؤ تکیے کمرے کی شان کو دوبالا کر رہے ہیں۔ کچھ ساز رکھے ہیں اور حضرت امیر خسرو محویت کے عالم میں ریاض کر رہے ہیں۔ صبح کا راگ گا رہے ہیں، دو شاگرد آتے ہیں اور تسلیم کر کے ادب سے بیٹھ جاتے ہیں۔ خسرو کچھ دیر بعد گانا موقوف کر دیتے ہیں)

خسرو :۔ صبح کے وقت ایک عجیب کیفیت ہوتی ہے گانے میں۔ روح سرشار ہو جاتی ہے۔

شاگرد ۱:۔ استاد یہ کونسا راگ ہے جو آپ ابھی گا رہے تھے۔

خسرو :۔ یہ راگ حجاز ہے ـــــ تم گاؤ۔

شاگرد ۱:۔ (تانپورہ پر انگلیاں رکھتا ہے اور راگ غلط سر میں گاتا ہے)

خسرو :۔ نہیں ـــــ سنو ـــــ (خود گا کر بتاتے ہیں) ـــــ کچھ فرق محسوس ہوا۔

شاگرد ۱:۔ جی ـــــ میں کوشش کرتا ہوں (پہلے سے کچھ بہتر گاتا ہے)

خسرو :۔ ہاں شاباش ـــــ میرے ساتھ گاؤ۔

(خسرو خود گاتے ہیں اور شاگرد بھی ساتھ گاتا ہے)

شاگرد ۲:۔ استاد راگ کے بارے میں کچھ بتلائیے۔

خسرو :۔ دیکھو۔ آروہ کے پہلے حصّے میں یہ راگ بلاول کی شکل ہے۔ سنو ـــــ (خسرو گاتے ہیں)

شاگرد ۲:۔ جی۔

خسرو :۔ اور آروہ کے دوسرے حصّے میں راگ بھیروں کی شکل ہے۔ (خسرو گا کر بتاتے ہیں)

شاگرد ۲: ۔ سمجھ گیا استاد۔
خسرو: ۔ تو اس طرح میں نے یہ نیا راگ بنایا۔ اور اس کا نام رکھا۔ حجاز۔
سنو۔ (خسرو پھر راگ حجاز گاتے ہیں) کرم کر دمورے سائیں
شاگرد ۱: ۔ استاد آپ نے ہندوستانی اور ایرانی راگوں کو ملا کر جو نئے نئے راگ ایجاد کیے ہیں یہ آپ کی بہت بڑی دین ہے سنگیت کی دنیا کو۔
شاگرد ۲: ۔ آپ کے اس احسان کو دنیا قیامت تک نہیں بھول سکتی۔
خسرو: ۔ میاں میں نے کیا کیا ہے۔ یہ تو وقت کی ضرورت ہے۔ اس وقت ہندوستان میں دو بڑی تہذیبوں کا سنگم ہو رہا ہے۔ ہندوستانی تہذیب اور ثقافت ادب، سنگیت اور دوسری کلاؤں کے ذریعہ فن کی بلندیوں تک پہنچی ہوئی ہے۔ اس طرح ایران کی تہذیب کا بھی اپنا ہی رنگ و آہنگ ہے۔
شاگرد ۲: ۔ بیشک۔ دونوں ہی تہذیبیں عظیم ہیں۔
خسرو: ۔ جس طرح میں نے شاعری میں نئے تجربے کیے ہیں اور مقامی بولیوں اور فارسی کے میل جول سے ایک سادہ اور عام فہم زبان کی طرح ڈالی ہے، اس طرح سنگیت میں بھی نئے تجربے کر رہا ہوں۔ اس ستار ہی کو لو۔ (نیچے سے ستار اٹھاتا ہے) اس ساز کو میں نے زندگی سے ہم آہنگ کر دیا ہے۔ بڑا لطف آتا ہے اسے بجانے میں ——
شاگرد ۱: ۔ میرا خیال ہے کہ اس طرح نئے تہذیبی میل جول کا ماحول پیدا ہو رہا ہے۔
خسرو: ۔ بیشک، اور یہ تہذیبی میل جول ہماری عمارتوں میں، لباس میں، کھانے پینے میں، یہاں تک کہ اٹھنے بیٹھنے کے آداب میں بھی ظاہر ہو رہا ہے۔ ہم تو نہ ہونگے لیکن یہ پیشین گوئی یاد رکھنا کہ کل کو اس میل جول سے ایک نیا ہندوستان پیدا ہوگا جس کی بنیاد پڑ چکی ہے —— بادشاہوں کے دربار میں نہیں، عوام کے دلوں میں، ان کی زندگی کے طور طریقوں میں۔
شاگرد ۲: ۔ بیشک۔ اور استاد میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ محبوب الٰہی کے محفلوں میں ہندو بھی اس شردھا سے جاتے ہیں جس عقیدت سے مسلمان جاتے ہیں۔
خسرو: ۔ بھئی، ویدانت اور تصوّف کا سرچشمہ ایک ہے۔ اور صوفی سنتوں کی ایک ہی بانی ہے۔ محبت پریم۔ تیاگ۔ قربانی۔ ایک دن یہ بادشاہت مٹ جائے گی۔ مگر صوفی سنتوں کی بانی ہندوستان کی مختلف جاتیوں، مذہبوں اور عقیدوں کو ایک ہی لڑی میں پرو دے گی۔

اور وہی کل کا ہندوستان ہوگا۔

شاگرد ۲:۔ بیشک ـــــ استاد! گستاخی کی معافی چاہتا ہوں، میں نے آپ سے قول قلبانہ اور نقش تو سیکھ لیے ہیں۔ اب ترانہ اور سکھا دیجیے۔

خسرو :۔ (مسکرا کر) کیوں، کیا کہیں مقابلے میں جانا ہے۔

شاگرد ۲:۔ جی ہاں۔ کچھ ایسی ہی بات ہے ـــــ اگر آپ اجازت دیں تو۔

خسرو :۔ میرا خیال ہے ابھی کچھ اور ریاض کرو۔

شاگرد :۔ جو حکم ـــــ تو استاد ترانہ۔

خسرو :۔ پہلے مجھے قول سناؤ۔

شاگرد ۲:۔ جی بہت اچھا ـــــ (قول گاتا ہے) مَن کُنتُ مولا فا علیؓ مولا . . . .

خسرو :۔ شاباش۔ ریاض اور کرنا ہوگا۔ اچھا ترانہ سنو ـــــ یہ راگ شہانہ میں ہے میری ہی ایجاد ہے

(خسرو ترانہ گاتے ہیں)

دونوں شاگرد :۔ سبحان اللہ استاد۔

خسرو :۔ اب آپ دونوں گائیں۔

شاگرد ۱:۔ میں تو اس کے رس میں اتنا کھو گیا ہوں کہ ہمت ہی نہیں ہو رہی ہے۔

شاگرد ۲:۔ جی ہاں استاد ـــــ دل میں بٹھانے کی کوشش کی ہے ان بولوں کو ـــــ انشاء اللہ کل سنائیں گے۔

خسرو :۔ (ہنس کر) اچھا۔

(دونوں شاگرد چلے جاتے ہیں۔ خسرو کچھ اداس اور متفکر ہیں۔ زیر لب گنگنا رہے ہیں ـــ ہیں ـــــ "بہت کٹھن ہے ڈگر پنگھٹ کی" ـــــ والدہ آتی ہیں اور بیٹے کی دل جوئی کرتے ہوئے کہتی ہیں)

والدہ :۔ کیا بات ہے بیٹا! آج کچھ اداس نظر آ رہے ہو۔

خسرو :۔ (تعظیم کے لیے اٹھتے ہوئے) نہیں اماں، کچھ سوچ رہا ہوں۔

والدہ :۔ کیا سوچ رہے ہو۔ یہی نا کہ میں نے تمھیں خط لکھ کر وائی اودھ حاتم خاں امیر علی سرحاندار کے دربار سے کیوں بلایا۔

خسرو:۔ نہیں اماں، مجھے تو افسوس تھا کہ میں پٹیالی سے لکھنؤ آپ سے ملے بغیر چلا گیا تھا۔ آپ کے بغیر تو میرا دل ہی نہ لگتا تھا۔ دلی بری طرح یاد آتی ہے۔ کیقباد نے تخت نشین ہوتے ہی مجھے دربار میں بلایا تھا۔ مگر آپ کو معلوم ہے کہ کس مجبوری میں ایک عرصہ دلی سے باہر رہا۔

والدہ:۔ ہاں بیٹا! معلوم ہے۔ نظام الملک کوتوال نے کسی کو چین سے نہیں بیٹھنے دیا۔ وہ مر گیا مگر اس کے کالے کارنامے دنیا کو یاد ہیں۔ اس نے سلطان بلبن کی وصیت پر عمل نہیں کیا اور تجربہ کار بغرا خاں کے بجائے اس کے نوجوان بیٹے کیقباد کو تخت پر بٹھا دیا تاکہ کٹھ پتلی بادشاہ کے پردے میں خود من مانی کرے کیخسرو کو قتل کرا دیا اور شہزادوں پر تو ظلم کے پہاڑ توڑے اچھا ہوا تم اس وقت دلی سے باہر تھے۔

خسرو:۔ اور کیا کرتا ــــــ اماں میں درباری شاعر ضرور ہوں، مگر ہر کس و ناکس کی خوشامد میرے بس کی بات نہیں۔ شاعری میں مبالغہ جائز ہے اس لیے حاکم کی شان میں قصیدہ لکھ دیتا ہوں ورنہ آپ جانتی ہیں کہ میرا دل بچپن سے ہی کسی اور طرف ہے۔

مرادِ اہلِ طریقت لباسِ ظاہر نیست
کمر بہ خدمتِ سلطان بند و صوفی باش

والدہ:۔ بیٹا مجھے وہ دن یاد ہے جب تم محبوب الٰہی کی خانقاہ سے نشۂ معرفت میں سرشار لوٹے تھے۔ اور تم نے کس بے ساختگی سے رنگ گایا تھا۔

خسرو:۔ یاد ہے ــــــ وہ لمحہ میری نظروں کے سامنے ہے ــــــ آج رنگ ہے۔۔۔

والدہ:۔ گاؤ بیٹے ــــــ سناؤ ــــــ وہ رنگ آج پھر سناؤ۔

خسرو:۔ (محویت کے عالم میں رنگ گاتے ہیں)

آج رنگ ہے، اے ماں رنگ ہے ری
آج رنگ ہے اے ماں رنگ ہے ری
موہے پیر پایو نجام الدین اولیا   موہے پیر پایو علا الدین اولیا
جو دیکھو وہی رنگ ہے ری
آج رنگ ہے اے ماں رنگ ہے ری
نجام الدین اولیا جگ اجیارو   جگ اجیارو، وہ تو جگت اجیارو
جب دیکھو مورے سنگ ہے ری
آج رنگ ہے اے ماں رنگ ہے ری

میں تو ایسو رنگ اور نہیں دیکھی — میں تورا رنگ من بھایو
آج رنگ ہے اے ماں رنگ ہے ری

دیس بدیس میں ڈھونڈ پھروں ہوں — تورا رنگ مورے من بھایو نجام الدین
آج رنگ ہے اے ماں رنگ ہے ری

والدہ :۔ روح تازہ ہوگئی — کیا کیفیت ہے — سبحان اللہ۔

خسرو :۔ اماں! میرے دل سے آواز آتی ہے کہ خسرو شاہی دربار سے بے نیاز ہو جا۔

والدہ :۔ بیٹا یہ دنیا ہے — دارالعمل — تم نے اپنے نانا کی گود میں پرورش پائی ہے۔ انھوں نے ۱۱۳ سال کی عمر پائی۔ اور آخر وقت تک اور ہر دور میں ہر دلعزیز رہے۔ انقلابات آئے، قتل وغارت کا بازار بار بار گرم ہوا۔ بادشاہتیں بدلیں۔ مگر بابا اپنی نیک نیتی، تدبر اور شرافتِ نفس کی بدولت ہر دور میں معزز رہے۔

خسرو :۔ مگر اماں! میں نانا جان جیسا تدبر اور شعور کہاں سے لاؤں۔

والدہ :۔ اپنے علم وفضل سے۔ خدا نے تمھیں شاعری اور موسیقی؛ دونوں خوبیوں سے نوازا ہے۔ شاعری کا سحر پتھر دلوں کو بھی موم کر دیتا ہے، اور موسیقی کا جادو سنگ دلوں کے سر پر بھی چڑھ کر بولتا ہے۔ تم ہر دور میں معزز رہوگے۔

خسرو :۔ لیکن یہ ناقدری کا دور ہے۔

ماں :۔ میری دعا ہے کہ تم ہر دور میں داد پاؤگے — اور دنیا تمھارے قدموں پر نہیں — تمھارے فن کی عظمت کے آگے جھکے گی۔

خسرو :۔ میری مثنوی قرآن السعدین، سلطان کیقباد کو بہت پسند ہے۔

والدہ :۔ کیوں نہ ہو۔ تم نے اس میں نفرت کی نہیں، محبت کی بات جو کی ہے۔ باپ بیٹوں کے دل جوڑنے کی داستان بیان کی ہے۔

خسرو :۔ ہاں، مگر مجھے اس اعلیٰ پایے کی تصنیف کے لیے دربارِ شاہی سے اتنا انعام واکرام نہیں ملا جس کی مجھے توقع تھی۔ میری خاطر خواہ عزت افزائی نہیں ہوئی۔

والدہ :۔ بیٹا! قناعت کو اپنا شعار بناؤ۔ انسان دوستی کے مسلک پر قائم رہو۔ بادشاہوں اور شہزادوں کے باہمی تنازعوں سے اپنے آپ کو بلند رکھو، چاہے بادشاہ کوئی ہو، تمھیں تو دربارِ شاہی سے

نسبت ہونی چاہیے۔

خسرو :۔ اماں! آپ نے مجھے ایک نئی روشنی دکھادی ـــــ دارالسلطنت میں اندر ہی اندر لاوا کھول رہا ہے۔ عیش پرست بادشاہ بسترِ مرگ پر ایڑیاں رگڑ رہا ہے۔ نہیں معلوم کیا ہونے والا ہے۔

والدہ :۔ وہی ہوگا جو حکومت کے بھوکوں اور اقتدار کے بھکاریوں کے درمیان ہوتا آیا ہے ـــــ کسی کا خون ـــــ کسی کا قتل ـــــ کسی کی حق تلفی ـــــ اور اس نوچ کھسوٹ میں رعایا گھن کی طرح پسے گی۔ خدا اپنا رحم کرے۔

حسام الدین قتلغ :۔ (اپنی فوجی وردی میں گھبرایا ہوا داخل ہوتا ہے) غضب ہوگیا۔ غضب ہوگیا۔

خسرو :۔ کیا ہوا بھائی۔

والدہ :۔ کیا ہوا بیٹے۔ تم کہاں سے آ رہے ہو۔ یہ کیا حال بنا رکھا ہے۔ آرام سے بیٹھو۔

قتلغ :۔ میں شاہی محل سے آ رہا ہوں جہاں قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔

خسرو :۔ کچھ بیان تو کرو کیا ہوا۔

قتلغ :۔ سلطان کیقباد کی رنگ رلیاں رنگ لائیں۔ ترکوں اور خلجیوں میں اقتدار کی جنگ چھڑ گئی۔ قتل و غارت کا بازار گرم ہوا۔ میدان خلجیوں کے ہاتھ رہا ـــــ ترکوں کا اقتدار ختم ـــــ اور جلال الدین خلجی کے قبضہ میں تختِ شاہی۔

خسرو :۔ اور سلطان کیقباد!

قتلغ :۔ ان پر فالج کا حملہ ہوا تھا ـــــ اس ہنگامے میں مفلوج سلطان کو ایک ترک ہی نے قتل کر دیا اور اپنی کسی پرانی دشمنی کا بدلہ لے لیا۔

والدہ :۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

خسرو :۔ حق مغفرت کرے۔ سلطان کو بداندیش مصاحبوں نے غلط راستے پر ڈال دیا تھا، ورنہ وہ جوہر قابل تھا۔

والدہ :۔ خدا بری صحبت سے بچائے۔

قتلغ :۔ اب آپ کیا کریں گے بھائی صاحب! ترکوں کے دشمنوں سے تعاون۔!!

خسرو :۔ میں ترک اور غیر ترک میں کوئی فرق نہیں سمجھتا، اصل چیز ہے انسانیت۔

قتلغ :۔ (جوش میں کھڑے ہو کر) خلجیوں نے انسانیت سوز حرکت کی ہے۔

خسرو :۔ انسانیت سوز حرکت تو ایک ترک نے بھی کی ہے ایک مفلوج ترک بادشاہ کو قتل کر کے۔ جلال الدین خلجی ایک تجربہ کار سپہ سالار ہے۔ اقتدار کی خاطر پہلے سازشیں کی گئیں۔ پھر دو فریقوں میں جنگ ہوئی ــــ یہ بھی ممکن تھا کہ جلال الدین مارا جاتا۔ تب کیا تم ترک سرداروں کی حرکت کو انسانیت سوز کہتے۔ شاید نہیں ــــ کیونکہ تم ترک ہو۔ مگر میں قومی برتری اور نسل و رنگ کے تعصّب کا شکار نہیں ہوں۔

والدہ :۔ مجھے بے حد خوشی ہوئی تمھارے خیالات سن کر۔

خسرو :۔ اور میں تو جنگ اور تشدّد کو انسانیت سوز حرکت سمجھتا ہوں۔ انسانوں کو پیدا کرنے اور مارنے کا اختیار صرف اللہ کو ہے۔ بندوں کو نہیں۔

والدہ :۔ قتل و خون ریزی اللہ کو پسند نہیں۔

قتلغ :۔ اب تو خوں ریزی ہو چکی ہے۔

خسرو :۔ ہاں اور فتح جلال الدین خلجی کی ہوئی، اب خلقِ خدا اس کے ساتھ ہے، پھر وہ پڑھا لکھا آدمی ہے، شاعر ہے، ایک تجربہ کار سپہ سالار ہے۔

قتلغ :۔ تو بھائی صاحب! آپ ــــ دربار میں . . . . . .

خسرو :۔ میں شاہی دربار سے وابستہ ہوں۔ کسی کا شخصی ملازم نہیں۔ دربار میں طلب کیا گیا تو ضرور جاؤں گا۔

مرادِ اہلِ طریقت لباسِ ظاہر نیست
کمر بہ خدمتِ سلطاں ببند و صوفی باش

(خسرو شعر پڑھتے ہوئے اس کے کیف میں گم ہیں۔ والدہ خسرو کو تعریف بھری نظروں سے دیکھ رہی ہیں۔ قتلغ خالی خالی نگاہوں سے بھائی کو دیکھ رہا ہے، اسٹیج کی روشنیاں آہستہ آہستہ گل ہو جاتی ہیں)

(۵)

(پردہ اٹھنے کے ساتھ شہنائی کی آواز بلند ہو جاتی ہے اور منظر روشن ہو جاتا ہے۔
شہنائی کی آواز اس وقت تک جاری رہتی ہے جب تک بادشاہ کی آمد کا اعلان
نہیں کیا جاتا ــــــــ
اسٹیج پر شاہی محل کا منظر دکھائی دیتا ہے۔ پس منظر میں اونچی اونچی محرابیں،
ایک نیا تختِ شاہی اسٹیج کے بیچوں بیچ رکھا ہے جو پر تکلف مسند سے آراستہ
ہے۔ تخت کے دونوں طرف امرائے سلطنت کیلیے قرینہ سے کرسیاں رکھی ہیں اور
وہاں امرا ہاتھ باندھے کھڑے ہیں۔ ان میں خسرو بھی موجود ہیں ــــــ داہنی طرف
کے دروازے پر سرخ محراب بنی ہوئی ہے۔ اونچے محل کی ہی محراب۔ اسٹیج کے ایک
طرف گوشۂ موسیقی بنایا گیا ہے جہاں ساز رکھے ہوئے ہیں۔ موسیقار پردے کے
پیچھے ہیں)

چوبدار:۔ باادب۔ باملاحظہ۔ ہوشیار۔ نگاہ روبرو۔ ظل اللہ، جہاں پناہ سلطان جلال الدین فیروزشاہ خلجی
جلوہ افروز ہوتے ہیں۔

(سب درباری ہاتھ باندھے کھڑے ہیں، نگاہیں جھکی ہوئی، جلال الدین خلجی ملک
احمد چپ کے ساتھ دروازے میں داخل ہوتے ہیں اور رک کر سرخ دروازے پر
احترام سے نظر ڈالتے ہیں)

احمد چپ:۔ جہاں پناہ! اب یہ محل آپ کا ہے۔

جلال الدین:۔ (آبدیدہ ہو کر) نہیں۔ یہ میرے آقا کا محل ہے۔ میں اپنی حیثیت کو بھولا نہیں ہوں۔ میں

آج بھی تصوّر میں آقا سلطان بلبن کو اس قصرِ شاہی میں موجود پاتا ہوں اور انھیں عقیدت سے سلام کرتا ہوں۔

(جلال الدین آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا ہوا تختِ شاہی پر جلوہ افروز ہوتا ہے۔ احمد چپ اپنی جگہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ بادشاہ اشارہ کرتے ہیں کہ سب امرا اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھ جائیں)

جلال الدین:۔ ہم خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتے ہیں کہ ہم نے تخت و تاج خلقِ خدا کی خدمت کے لیے قبول کیا ہے۔ ہمارے پاس جو اختیار اور طاقت ہے وہ اللہ کی امانت ہے۔ ہمارے خاندان میں کوئی بادشاہ نہیں ہوا۔ خدا نے ہمیں یہ مرتبہ عوام کی خدمت کے صلہ میں بخشا ہے۔ اور عوام الناس کی بھلائی کے لیے کام کرنا ہی ہماری زندگی کا نصب العین ہے۔ ہماری سلطنت میں خاندانی برتری کی کوئی اہمیت نہ ہوگی۔ ذات پات کی تفریق اور مذہبی اور نسلی امتیاز ہماری نظر میں ہیچ ہیں۔ لوگوں کو ان کی صلاحیت اور قابلیت کے اعتبار سے ہی عہدے دیے جائیں گے ——— ہم اپنے دور میں علم و فضل، شاعری، رقص و موسیقی، نقاشی، عمارت گری اور دیگر فنون کو ترقی کی معراج پر دیکھنا چاہتے ہیں' اور ایسا پُرامن دور چاہتے ہیں جس میں انسان انسان کو اپنا بھائی سمجھے اور اپنے معبودِ حقیقی کو پہچانے۔ ہم نے خواجہ خطیر کو وزارتِ عظمیٰ کا عہدہ تفویض کیا ہے۔

خواجہ خطیر:۔ (اپنی کرسی سے اٹھ کر آداب بجالاتے ہیں) ظلِ سبحانی، جہاں پناہ! سلطان جلال الدّین فیروز شاہ خلجی کی خدمتِ اقدس میں تختِ دہلی پر رونق افروز ہونے کے اس مبارک اور تاریخی موقعہ پر یہ ناچیز اپنی طرف سے اور تمام اہلِ دربار کی طرف سے ہدیۂ مبارک باد پیش کرتا ہے۔

(پس منظر سے شہنائی بج اٹھتی ہے اور ماحول پر اس کی آواز چھا جاتی ہے)

ظلِ سبحانی! آپ نے تختِ شاہی پر جلوہ افروز ہو کر ملک میں پھیلی بدامنی، بے چینی اور طوائف الملوکی کا خاتمہ کر دیا ہے۔ یہ تاریخ کا اہم دن ہے جب نیم جان ستارے دم توڑ چکے ہیں اور ایک نیا سورج خلجی خاندان کی صورت میں طلوع ہوا ہے۔ اس جشن کے موقعہ پر جہاں پناہ نے بے شمار مستحق افراد کو انعام واکرام اور اعلیٰ مراتب سے نوازا ہے، یہ ناچیز ہدیۂ تشکر پیش کرتا ہے کہ حقیر کو عہدۂ وزارت سے سرافراز فرمایا۔ مجھے یہ اعلان کرتے ہوئے مسرّت

ہو رہی ہے کہ ظلِ سبحانی نے اس دور کے سب سے بڑے شاعر حضرت امیر خسرو کو مصحف دار اور ندیم کے عہدے پر سرفراز فرمایا ہے۔ اور دربار شاہی میں ان کی وہی حیثیت ہوگی جو بڑے ملک کی ہوتی ہے!

(خسرو اٹھ کر آداب بجالاتے ہیں)

خواجہ خطیر:۔ اب اجازت ہو تو شاہی موسیقار محمد شاہ، مغنیہ فتوحہ اور نصرت خاتون اپنے فن کا مظاہرہ کریں۔

(موسیقار نہایت ادب سے اسٹیج پر داخل ہوتے ہیں اور آداب بجالا کر اپنی اپنی نشست پر بیٹھ جاتے ہیں اور ساز چھیڑتے ہیں)

موسیقار:۔
مبارک ہو مبارک تختِ شاہی
مبارک یہ گھڑی ظلِ الٰہی
مبارک ہو شکوہِ خسروانہ
مبارک عزّ و شانِ کج کلاہی
مبارک دولتِ دنیا و عقبیٰ
تمھیں بخشی گئی عالم پناہی
نہ ہوگا پھر زمیں پر جشن ایسا
فلک پر دی ستاروں نے گواہی

محمد شاہ:۔ اب حضرت امیر خسرو کا کلام پیش کیا جاتا ہے۔

آمد بہار شد چمن و لالہ زار خوش
وقتےست خوش بہار کہ وقتِ بہار خوش
در باغ با ترانۂ بلبل دریں ہوا
مستی خوش است و بادہ خوش ست و بہار خوش

(سب درباری مرحبا سبحان اللہ کہتے ہیں)

محمد شاہ:۔ اب ایک نادر غزل پیش ہے جس میں عوام کے جذبات بھی ہیں اور زبانوں کا سنگم بھی۔

مغنیہ:۔
زحالِ مسکیں مکن تغافل دورائے نیناں، بنائے بتیاں
کہ تابِ ہجراں ندارم اے جاں، نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں

شبانِ ہجراں دراز چوزلف و روزِ وصلش چو عمر کوتاہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں
یکایک از دل دو چشم جادو بہ صد فریبم ببرد تسکیں
کسے پڑی ہے جو جا سناوے پیارے پی کو ہماری بتیاں
چو شمع سوزاں، چو ذرہ حیراں، ز مہر آں مہ بگشتم آخر
نہ نیند نیناں، نہ انگ چیناں، نہ آپ آویں نہ بھیجیں پتیاں
بحقِ روزِ وصالِ دلبر کہ داد مارا فریب خسرو
سپیت من کے دورائے لاکھوں جو جائے پاؤں پیا کی کھتیاں

(واہ واہ اور داد و تحسین کا شور جاری رہتا ہے۔ محفل پورے شباب پر ہے۔ اسٹیج کی روشنیاں گل ہو جاتی ہیں)

●

(۶)

(روشنی ہوتی ہے تو اسٹیج پر جمو بھٹیارن کی دوکان نظر آتی ہے۔ جمو تھلے پر بیٹھی ہے اور دوکان کے ملازموں پر بھی نگرانی کی نظر رکھے ہوئے ہے۔ اور کوئی گاہک بھی اس کی توجہ سے بچ نہیں پاتا۔ منہ میں پان کی گلوری دبائے ٹھسے سے بات کرتی ہے ـــــ ایک گاہک جا رہا ہے، ایک آ رہا ہے۔ وہ سب پر ایسی نظر ڈالتی ہے کہ جس میں لگاؤ بھی ہے اور بے تعلقی بھی ـــــ دوکان میں بیٹھے ایک دو آدمی ایک دوسرے کو شعر سنا رہے ہیں۔ دو آدمی کھانا کھا رہے ہیں بشیدو کھڑا ہے۔ رکابی گرنے کی آواز آتی ہے)

جمو :۔ ارے شیدو! رکابیوں پر کیوں زور آزما رہا ہے۔

شیدو :۔ ہاتھ سے چھوٹ گئی، جان کے نہیں گرائی۔

گاہک ۱: (چیخ کر) ارے شیدو پانی تو لا۔

شیدو :۔ اچھا اچھا ـــــ کیوں دوکان سر پر اٹھا رہا ہے۔

جمو :۔ ارے فیرینی کے سکورے ختم ہوگئے کیا۔

شیدو :۔ نہیں نہیں۔ بہت ہیں۔ اندر رکھے ہیں۔

(ایک آدمی راستہ چلتے چلتے رک کر جمو کو دیکھنے لگتا ہے)

جمو :۔ ارے آ رہا ہے نہ جا رہا ہے۔ کھڑا کھڑا کیا گھور رہا ہے۔

(اگالدان میں تھوکتی ہے جو پاس ہی رکھا ہے)

آدمی :۔ جمو کی دوکان یہی ہے ـــــ

چمو :۔ تجھے کس کی نظر آ رہی ہے ـــــ ارے شیدو! دیکھنا تو یہ دوکان پوچھ رہا ہے۔

شیدو :۔ (انگوچھا کندھے پر ڈالے دوکان کے اندر سے باہر آتا ہے) آؤ میاں۔! کیا کھانا ہے۔

(اندر گھستا ہے) چمو کی دوکان کی فیرنی کی تعریف سنی ہے۔

چمو :۔ (آنکھوں میں چمک لاکر) ہوں، آدمی شوقین معلوم ہو رہا ہے۔

آدمی :۔ بہت دور سے آیا ہوں، (آدمی بیٹھ جاتا ہے اور شیدو اسے کھانے کی چیزیں لاکر دیتا ہے)

شیدو :۔ تو پیٹ بھر کھاؤ ـــــ

چمو :۔ ذرا طبیعت سے کھلاؤ۔

(چمو کچھ گنگناتی ہے)

شرفو :۔ (دھنیا ہے جو اپنے کندھے پر دھنکی رکھے ہوئے آتا ہے اور دھنکی ایک طرف کو رکھ کر چمو پر نظر ڈالتا ہوا اور گنگناتا ہوا دوکان کے اندر جاتا ہے)

زحالِ مسکیں مکن تغافل دورائے نیناں بنائے بتیاں

چمو :۔ (شرفو کی آواز میں یہ مصرعہ سن کر اس کے کان کھڑے ہوتے ہیں) ارے پھر تو سنا، کیا گا رہا تھا تو ـــــ اے شرفو!

شرفو :۔ نہیں سناتا۔ فیرنی کے ڈبل پیسے لیتی ہے اور گانا سنتی ہے مفت میں۔

چمو :۔ ارے تو بھی کیا یاد کرے گا ـــــ آج مفت کھلاؤں گی فیرنی ـــــ تو سنا تو نئی چیز کیا ہے۔

شرفو :۔ لے سن ـــــ زحالِ مسکیں مکن تغافل دورائے نیناں بنائے بتیاں

چمو :۔ ارے کس کی ہے یہ غزل۔

شرفو :۔ خسرو جی کی ہے۔

چمو :۔ وہی امیر خسرو۔ کہہ مکرنیاں اور پہیلیوں والے۔

شرفو :۔ ہاں ہاں امیر خسرو ـــــ ان کی غزل شاہی دربار میں گائی گئی تھی۔ آگے سن

سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

چمو :۔ بڑی مرچ مصالحے والی غزل ہے، مزا آ گیا۔

شرفو :۔ چمو۔ زحالِ مسکیں مکن تغافل . . . . (آنکھ مارتا ہے)

چمو :۔ ارے اپنی کھال میں رہ۔ سنبھال اپنی دھنکی ـــــ ذات کا دھنا اور بات کرتا ہے امیر خسرو

کی غزل کی۔

شرفو :۔ دیکھ جمو! اگر میں دھنا ہوں تو تو بھی تو بھٹیارن ہے۔

جمو :۔ ہاں ہوں ـــــ اپنے تھلے پر بیٹھتی ہوں۔ صبح سے شام تک نہ جانے کتنے بھوکوں کا پیٹ بھرتی ہوں مگر میں کسی کے دروازے پر نہیں جاتی۔ اور تو . . . .

شرفو :۔ ہاں تو اکڑی بیٹھی رہتی ہے اپنی جگہ۔ اور میں گلی گلی پھرتا ہوں لوگوں کے آرام کے لیے گدگدے بستر اور گدے مہیا کرنے کے لیے۔

جمو :۔ چل چل بیٹھ ـــــ بہت شیخی بگھارتا ہے۔

شرفو :۔ دیکھ جمو۔ میں روئی دھننے کا کام کرتا ہوں، کوئی چوری تو نہیں کرتا ـــــ اور اگر تو دھیان سے سنے تو میری دھنکی سے آواز نکلتی ہے۔ جم۔ جم، جمو۔ جمو۔ جم۔ جم۔

جمو :۔ ارے چل چل۔ یہ منہ اور مسور کی دال۔

شرفو :۔ جمو۔ زحالِ مسکیں مکن تغافل . . . . . (خسرو دور سے آتے نظر آتے ہیں)

جمو :۔ لے خسرو جی ادھر ہی آرہے ہیں۔ ان سے شکایت نہ کروں تو کہنا کہ یہ شرفو آپ کی غزل کی مٹی پلید کر رہا ہے، تجھے غزل سے کیا واسطہ۔

شرفو :۔ ارے خسرو جی بادشاہوں کے لیے ہی نہیں، ہم غریبوں کے لیے بھی لکھتے ہیں۔

جمو :۔ ہاں یہ تو ہے، جب بھی ادھر سے گزرتے ہیں، میرا حال ضرور پوچھتے ہیں۔

خسرو :۔ (قریب آتے ہیں) کہو جمو کیا حال ہے۔

جمو :۔ آپ کی دعا ہے۔ آج آپ کی غزل کا ایک شعر سنا۔ زحالِ مسکیں مکن تغافل، یہ دھنا گا رہا تھا۔

خسرو :۔ اچھا اچھا ـــــ شرفو کیسے ہو۔

شرفو :۔ اچھا ہوں حجور ـــــ یہ جمو کہہ رہی تھی کہ دھننے کو گانے اور غزل سے کیا واسطہ۔

خسرو :۔ نہیں جمو جی ـــــ کسی استاد نے ان سب کو ایسا سکھایا ہے کہ ہر دھنکی سے ایک سی ہی آواز آتی ہے، اور ایک حرکت میں بھی تال کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔

جمو :۔ ارے خسرو جی! آپ نے تو اسے آسمان پر چڑھا دیا۔

خسرو :۔ میں منہ دیکھی نہیں کہہ رہا ہوں۔ سن لو ـــــ کیا تال ہے ـــــ بجاؤ ذرا۔ (شرفو دھنکی بجاتا ہے)

جمو :۔ (دوکان کے ایک آدمی سے زور سے) ارے سیدو! فیرینی لا خسرو جی کے لیے ـــــ

خسرو :۔ سنا چموجی۔ کیا مست آواز ہے ــــــــ

در پئے جاناں۔ جاں ہم رفت۔ جاں ہم رفت۔ جاں ہم رفت۔ رفت رفت جاں ہم رفت۔

ایں ہم رفت واں ہم رفت۔ آنہم رفت۔ آنہم رفت۔ اینہم رفت۔ اینہم آنہم۔ آنہم رفت،

رفتن۔ رفتن۔ رفتن دہ۔ دہ۔ دہ۔ رفتن دہ ــــــ رف۔ رف۔ رفتن دہ۔ رفتن دہ۔

(سب بے ساختہ تالی بجاتے ہیں)

چمو :۔ ارے کمال کر دیا آپ نے خسرو جی۔

خسرو :۔ میں نے کیا کمال کیا۔ کمال تو یہ کرتے ہیں۔

شرفو :۔ ہم کس قابل ہیں حجور۔ دھنکی دھننے کے علاوہ ہمیں اور آتا ہی کیا ہے۔

خسرو :۔ یہ کم بات نہیں ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ سنگیت کا صحیح سُر تال عام زندگی سے ہی ملتا ہے۔ غور کرو تو ہر جگہ سنگیت ہی سنگیت ہے۔ دھننے کی دھنکی میں سقے کے کٹوروں میں ــــــ اور تو اور ــــ گھوڑے کی چال میں، چڑیوں کی چہکار میں، ہوا کی رفتار میں ــــــ بس خدا کی قدرت کو دیکھنے اور پرکھنے والی نظر چاہیے۔

چمو :۔ خسرو جی یہ ذرا سی فیرینی چکھ لیجیے۔

خسرو :۔ بس تمہارے کہنے سے ہی چکھ لی۔

چمو :۔ ذرا سی لے لیجیے گا ــــ ہو سکتا ہے ہماری فیرینی پر بھی کچھ لکھ دیں۔ اور ہمارا بھی نام ہو جائے

(خسرو ایک دو چمچہ فیرینی کھاتے ہیں)

خسرو :۔ تمھاری فیرینی کی مٹھاس بھی میری شاعری میں اتر آئے گی۔

چمو :۔ خسرو جی! آپ کے ایک دوست ہیں۔ اچھا سا نام ہے ان کا ــــ سجزی

خسرو :۔ ہاں ہاں امیر حسن سجزی۔ بڑے شاعر ہیں، ہم دونوں پر ایک ہی مرشد کی نظرِ کرم ہے۔

چمو :۔ وہ کبھی کبھی اِدھر سے گزرتے ہیں مگر۔۔۔۔

خسرو :۔ میں سمجھ گیا تم کیا کہنا چاہ رہی ہو ــــــ

(امیر حسن سنجری دور سے آتے دکھائی دیتے ہیں)

چمو :۔ لیجیے ــــ وہ آ گئے ــــ آئیے حسن صاحب! آپ ہی کا ذکر ہو رہا تھا۔ کبھی کبھی ہم پر بھی نظر ڈال دیا کیجیے۔

حسن :۔ (معنی خیز انداز میں) آپ پر کس کی نظر نہیں۔

چمو :۔ شکریہ۔ ہماری فیرینی چکھ لیجیے۔
حسن :۔ اس وقت نہیں۔ شکریہ۔
خسرو :۔ حسن! تم کہاں جارہے تھے۔
حسن :۔ میں تو تمھیں مبارک باد دینے تمھارے گھر جارہا تھا۔
خسرو :۔ کس بات کی مبارک باد۔
حسن :۔ دربارِ شاہی میں تمھاری جو عزت افزائی ہوئی وہ ہم سب کے لیے قابلِ فخر ہے۔ جلال الدین خلجی سخن شناس ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر بادشاہ علم و فن کی قدر کرے تو عوام میں بھی علم و فن کا صحیح ذوق پیدا ہوتا ہے۔
خسرو :۔ بیشک۔
حسن :۔ تمھاری یہ نئی غزل تو غضب کی ہے۔ فارسی اور ہندوی کو ملا کر کیا عمدہ غزل کہی ہیں تم نے۔ ایک نئی ادبی زبان کی بنیاد ڈال دی۔
خسرو :۔ شکریہ۔
حسن :۔ زبان کے سلسلے میں تمھارا یہ نیا تجربہ مجھے تو ایک تاریخی کارنامہ نظر آرہا ہے۔
خسرو :۔ ارے بھئی اتنی تعریف نہ کرو۔ یہ تو دوست نوازی ہوئی۔
حسن :۔ بھئی عوام کے جذبات کو عوام کی زبان میں لکھنا کہنے میں آسان ہے، مگر دراصل مشکل کام ہے۔ اور تم نے ایک نئی اور عام فہم ادبی زبان کی بنیاد ڈال دی ہے۔
خسرو :۔ شکریہ۔
حسن :۔ تمھاری کہ مکرنیاں، دوسخنے اور پہیلیاں وغیرہ تو خوب تھیں ہی مگر یہ غزل سبحان اللہ۔
چمو :۔ حسن صاحب! ان کی غزل کی مقبولیت کا تو یہ حال ہے کل دربار میں گائی گئی اور آج شہر کے بچے بچے کی زبان پر ہے۔ شرفو دھنا گا رہا تھا۔
شرفو :۔ میں بھی تو سخن فہم ہوں حسن صاحب۔
حسن :۔ بیشک۔
خسرو :۔ اچھا حسن! اب چلو گھر۔
حسن :۔ نہیں خانقاہ جانا ہے۔
خسرو :۔ تو چلو ساتھ چلتے ہیں ــــــ

(دونوں باہر چلے جاتے ہیں۔ چھمو کی دوکان کی آہر جا ہر جاری ہے۔)

شرفو :۔ واہ واہ۔ خسرو جی بھی خوب ہیں ـــــ باتوں باتوں میں ہی کیا کہہ گئے۔
در پئے جاناں۔ جاں ہم رفت ـــــ

چھمو :۔ پورا سناؤ۔

شرفو :۔ پہلے فیرنی کا سکورا منگا۔

چھمو :۔ تو سنا تو۔ فیرنی کے سکورے بہت ہیں۔

شرفو :۔ در پئے جاناں جاں ہم رفت۔ جاں ہم رفت ـــــ جاں ہم رفت . . . . .

(شرفو دھن کے ساتھ الفاظ ادا کرتا ہے۔ اس میں کھویا ہوا ہے ـــــ اور چھمو پر بھی ایک کیفیت طاری ہے۔ اسٹیج کی روشنیاں گل ہو جاتی ہیں)

●

(۷)

(امیر خسرو کا گھر ــــــ خسرو کی والدہ تخت پر بیٹھی کچھ کاڑھ رہی ہیں۔ اور اپنی دھن میں گنگنا بھی رہی ہیں ــــــ "بہت کٹھن ہے ڈگر پنگھٹ کی"۔)

عفیفہ :۔ (تیزی سے آتی ہے) دادی اماں ــــــ دادی اماں (گلے میں بانہیں ڈال دیتی ہے)

والدہ :۔ (ہنستے ہوئے) اری ۔ اری ۔ چھوڑ ــــــ بالکل اپنے باپ کی طرح شریر ہے ــــــ چھوڑ تو مجھے۔

عفیفہ :۔ نہیں، پہلے ایک وعدہ کیجیے۔

والدہ :۔ اری کیسا وعدہ۔

عفیفہ :۔ آپ میری گڑیا کے لیے بہت اچھا سا جوڑا کاڑھیں گی۔ اس کا بیاہ کرنے والی ہوں میں۔

والدہ :۔ (ہنس کر لاڈ کرتے ہوئے) اچھا اچھا ــــــ وہ تیری گڑیا ہے نا۔

عفیفہ :۔ جی ہاں۔

والدہ :۔ اور میری گڑیا تو یہ ہے (بچی کو پیار کرتی ہے) دیکھ ــــــ میں اپنی گڑیا کے لیے کیسا بڑھیا کرتہ کاڑھ رہی ہوں۔

عفیفہ :۔ اور میری گڑیا کا؟

والدہ :۔ بھئی اپنی گڑیا کا کرتہ تم خود کاڑھو۔

عفیفہ :۔ (ٹھنک کر) اوں ہوں۔ مجھے سینا پرونا کہاں آتا ہے۔

والدہ :۔ میں سکھاؤں گی۔

عفیفہ :۔ جب سکھائیں گی۔ سکھائیں گی ــــــ شادی تو اس کی اب ہے۔ دادی اماں! آپ تو

بس بات ٹال دیتی ہیں۔ آج تو میں وعدہ لے کر ہی رہوں گی۔ معلوم ہے میری گڑیا کیا کہہ رہی تھی۔

والدہ :- کیا کہہ رہی تھی۔

عفیفہ :- کہہ رہی تھی ـــــ تمھاری دادی اماں بہت اچھی کشیدہ کاری کرتی ہیں۔ اور تم مجھے سیدھے سادے کپڑے پہناتی ہو ـــــ کیوں؟

والدہ :- (ہنس کر بچی کو گود میں بھرتے ہوئے) ہوں ـ یہ تمھاری گڑیا کہہ رہی تھی ـ یا میری یہ پیاری پیاری گڑیا کہہ رہی ہے۔

عفیفہ :- دادی اماں ـــــ اونہہ ـــــ ہنہ۔

والدہ :- بھئی، اب تو آنکھوں سے اچھی طرح دکھائی بھی نہیں دیتا، بس یونہی دل بہلانے کا شغل ہے یہ۔

عفیفہ :- لیکن میری گڑیا کا کرتا تو کاڑھنا ہی ہوگا۔

والدہ :- اچھا اچھا کاڑھ دوں گی ـــــ پہلے یہ کرتہ تو پورا کرلوں۔

عفیفہ :- میری دادی اماں۔

بہو :- (اندر سے آواز آتی ہے) عفیفہ! کیوں اپنی دادی اماں کو پریشان کر رہی ہو ـــــ یہاں آؤ۔ (بہو باہر آجاتی ہے)

والدہ :- نہیں بہو ـــــ یہ کیوں مجھے پریشان کرے گی۔ یہ تو میری گڑیا ہے ـ پیاری پیاری۔ ہنستی بولتی ـ چلتی پھرتی گڑیا ـــــ ہے نا۔

(عفیفہ خوشی سے ہنستی ہے)

بہو :- (ہنس کر) اماں! آپ اس کے بہت ناز اٹھاتی ہیں۔

والدہ :- مجھے اس میں لطف آتا ہے۔ خدا اسے زندگی کی سب خوشیاں عطا کرے۔

(باہر سے شور و غل کی آواز سنائی دیتی ہے جیسے لوگ دوڑ رہے ہیں۔ بھاگ رہے ہیں۔ عفیفہ باہر جانے لگتی ہے)

والدہ :- اری بیٹی ـــــ باہر نہ جانا ـــــ اندر گھر میں جاؤ ـــــ بہو دیکھنا تو یہ شور کیسا ہے۔

بہو :- (دروازے پر جاکر ادھر ادھر دیکھتی ہے) اماں کچھ معلوم نہیں ہو رہا ہے۔ بس لوگ ادھر سے ادھر بھاگ رہے ہیں۔ ایک عجیب ہلچل ہے۔

والدہ :- خدا خیر کرے۔ خدا خدا کرکے کچھ دن تو امن چین سے گزرے تھے۔ شاید دلی والوں پر

پھر کوئی آفت نازل ہونے والی ہے۔

قتلغ :۔ (اپنی فوجی وردی میں) باہر سے گھبرایا ہوا آتا ہے) اماں ـــــ اماں۔ بھائی صاحب کہاں ہیں۔

والدہ :۔ پتہ نہیں ـــــ دربار میں ہوں گے یا خانقاہ میں ـــــ یہ شور کیسا ہے بیٹے۔

قتلغ :۔ ایک اور انقلاب برپا ہو گیا۔

والدہ :۔ خیر تو ہے ـــــ اب کیا ہوا۔

قتلغ :۔ وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ ایک نیک دل مگر کمزور بادشاہ ایک چالاک اور طاقتور سپہ سالار کے دام میں آ گیا جس علاء الدین کو جلال الدین نے گودوں میں کھلایا تھا۔ جس کے ناز اٹھائے تھے، جس کو داماد بنایا تھا ـــــ حکومت کے لالچ میں اسی نالائق بھتیجے نے چچا کے خون سے اپنے ہاتھ رنگ لیے۔

بہو :۔ کیا خون سفید ہو گیا ہے۔

والدہ :۔ لیکن یہ سب ہوا کیسے۔

قتلغ :۔ جب خبر ملی کہ علاء الدین دیوگری کی مہم سے جیت کر بہت سا مالِ غنیمت اور لاتعداد ہاتھی لے کر واپس آ رہا ہے تو بادشاہ کی خوشی کی انتہا نہ رہی ـــــ وہ اپنے مشیروں کے انکار کرنے کے باوجود اس کے استقبال کو خود پہنچا۔

والدہ :۔ تو بادشاہ کے ساتھ فوج تو ہوگی۔

قتلغ :۔ نہیں ـــــ علاء الدین کے چھوٹے بھائی اور جلال الدین کے چھوٹے داماد الماس بیگ نے مکر و فریب کا جال بچھایا اور بادشاہ کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ تنہا اور غیر مسلح علاء الدین سے کڑہ کے پاس ملیں گے اور چہیتے بھتیجے کو گلے سے لگائیں گے۔

بہو :۔ اور اس نے گلے ملتے وقت چھرا گھونپ دیا۔!!

قتلغ :۔ نہیں۔ خود قتل نہیں کیا، اختیار الدین کو اشارہ کیا جس نے بادشاہ کا سر تن سے جدا کر دیا۔

والدہ :۔ ہے۔ ہے ـــــ کیا گزری ہوگی بادشاہ کے دل پر۔

قتلغ :۔ وہ چلاتا ہی رہ گیا کہ احسان فراموش علاء الدین تو نے یہ کیا کیا۔

بہو :۔ تو اب بادشاہ کے ساتھی کیا کر رہے ہیں۔

قتلغ :۔ چڑھتے سورج کو سلام ۔ علا الدین دونوں ہاتھوں سے سونا چاندی لٹاتا ہوا دارالسلطنت کی طرف آرہا ہے ۔ ایک ہل چل مچی ہوئی ہے۔

(باہر شور بڑھتا ہے)

والدہ :۔ پھر شور و غل بڑھ گیا۔

قتلغ :۔ اچھا اماں، میں دیکھتا ہوں باہر کیا ہو رہا ہے۔ آپ دروازہ بند کر لیجیے۔

والدہ :۔ (قتلغ جاتا ہے) بیٹا! اپنا خیال رکھنا۔

بہو :۔ (دونوں دروازے بند کر دیتی ہے) خدا جانے وہ کہاں ہوں گے۔

والدہ :۔ اللہ ہی نگہبان ہے ـــــ (دروازہ پر دستک ـــــ بہو دروازہ کھولتی ہے)

خسرو :۔ (پریشان حال داخل ہوتا ہے) اماں! اب تو جی چاہتا ہے کہ دنیا سے کنارہ کش ہو جاؤں۔ مگر پیر و مرشد حضرت نظام الدین اولیا کا حکم ہے کہ زندگی کے گرم و سرد کا ذائقہ چکھنا بھی ضروری ہے۔

(بہو پانی کا گلاس خسرو کو دیتی ہے ـــــ وہ پانی پیتے ہیں اور نڈھال سے تخت پر بیٹھ جاتے ہیں)

خسرو :۔ ما غریباں را تماشائے چمن در کار نیست

داغ ہائے سینۂ ما کم تراز گلزار نیست

ماں! مجھے سیرِ چمن کی ضرورت نہیں ہے، میرے سینے کے زخم کسی گلزار سے کم نہیں۔

والدہ :۔ بیٹا! میں تیرا درد سمجھتی ہوں مگر میں نے ابھی قتلغ سے علا الدین کی احسان فراموشی اور سفاکی کی مختصر خونیں داستان سنی ہے

خسرو :۔ اماں، جلال الدین میں بادشاہوں جیسا غرور تھا ہی نہیں۔ اس کا قتل تاریخ کا خونی اور عبرت ناک سانحہ ہے۔

والدہ :۔ بیٹا! تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے، جلال الدین خلجی بھی تو کسی بادشاہ کو قتل کر کے ہی تخت پر بیٹھا تھا۔

خسرو :۔ مگر وہ جنگ تھی ـــــ اور یہ سراسر احسان فراموشی اور نمک حرامی۔

والدہ :۔ قتلغ کہہ رہا تھا کہ علا الدین دولت لٹاتا ہوا آرہا ہے۔

خسرو :۔ ہاں، ایک ہاتھ میں تلوار اور ایک ہاتھ میں سونا لے کر دہلی میں داخل ہونے والا ہے۔

والدہ :۔ تو تلوار سے سرکشوں کے سر قلم کریگا اور سونے سے خون کے دھبے دھوئیگا۔ اور لالچی لوگوں کے دامن بھرے گا۔

خسرو :۔ اماں یہ وحشیانہ کھیل کب تک!

والدہ :۔ وحشیانہ پن آدمی کے خمیر میں شامل ہے، اس پر فتح پائی جا سکتی ہے صرف اپنے نفس کو قابو میں رکھ کر۔

خسرو :۔ میں تو اس وحشی دنیا سے تنگ آچکا ہوں، اور گوشہ نشین ہو جانا چاہتا ہوں۔

والدہ :۔ تم جیسے نیک اور باعمل لوگ بھی اگر کنارہ کش ہو جائیں تو وحشیانہ پن کو اور کھُل کھیلنے کا موقع ملے گا۔ نفرت کے اس ماحول کو بدلنے کے لیے آج محبت اور انسانیت کے نغموں کی ضرورت ہے۔

خسرو :۔ نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے۔

والدہ :۔ وہ جن کے دل میں انسانیت کا سوز ہے ____ تمھیں اپنے فن کی لاج رکھنی ہے۔ ہاں اس جگہ ایک لمحہ کے لیے بھی نہ ٹھہرنا جہاں تمھارے فن کی ناقدری ہو۔

خسرو :۔ اماں! آپ کی باتیں چراغِ راہ ہیں۔

والدہ :۔ بیٹا میں چراغِ سحری ہوں۔ جھلملا رہی ہوں۔ نہ جانے کب یہ چراغ گل ہو جائے۔ مگر میری دعا ہمیشہ تمھارے ساتھ رہے گی۔ تم مجھے اپنے شعروں کی تاثیر اور اپنے سنگیت کی لَے میں موجود پاؤگے۔

خسرو :۔ اماں آج آپ یہ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔

بہو :۔ آپ کے بغیر ہماری زندگی کا تصور ہی نہیں۔ اور آپ ہی ناامید ہوتی جا رہی ہیں۔

والدہ :۔ زندگی سے ناامید نہیں ہوں، مگر اس پر بھی ایمان رکھتی ہوں کہ موت برحق ہے۔

(باہر سے شور کی آوازیں پھر آتی ہیں)

دیکھنا پھر کوئی ہنگامہ ہوا۔

(بہو دروازے سے دیکھتی ہے۔ خسرو باہر چلے جاتے ہیں)

والدہ :۔ خدا اسے عمرِ خضر دے۔ میری عمر بھی اسے لگ جائے۔

(والدہ ہاتھ بلند کیے نظریں اوپر اٹھائے خلا میں گھور رہی ہے۔ بہو کے کان باہر کے شور پر لگے ہوئے ہیں۔ روشنی گل ہو جاتی ہے)

●

(۸)

(اسٹیج پر روشنی ہوتی ہے تو علا الدین خلجی اپنے چند خاص وزیروں کے درمیان تخت پر جلوہ افروز نظر آتا ہے۔ خواجہ خطیر نمایاں حیثیت کے مالک ہیں۔ یہ دربارِ عام نہیں ہے۔ بلکہ مخصوص محفل ہے)

علا لدین:۔ آج ہم بہت خوش ہیں۔ تم جانتے ہو ہماری زندگی مسلسل جدّوجہد سے عبارت ہے۔ آج ہم بہت مطمئن ہیں کہ ہم نے زندگی کے جو حسین خواب دیکھے تھے ان کی تعبیریں سامنے ہیں۔ ایک عظیم سلطنت۔ ایک قابلِ رشک زندگی۔

خواجہ خطیر:۔ بیشک، آج مشرق سے مغرب تک اور شمال سے جنوب تک جہاں پناہ کا سکّہ چلتا ہے۔ دنیا کی نعمتیں حضور کے قدموں میں ہیں۔

علا الدین:۔ ہاں، مگر ہم نے عیش وعشرت کو اپنا نصب العین نہیں بنایا، سلطنت کی وسعت اپنے مسائل بھی ساتھ لے کر آتی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ بادشاہ کا فرض ہے رعایا کے دل میں یہ اعتماد پیدا کرنا کہ اس کی زندگی اور جان و مال محفوظ ہے۔ ہم نے انتظامِ سلطنت میں جو اصلاحات کی ہیں تاریخ ان کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔

خواجہ خطیر:۔ بیشک جہاں پناہ کے حسنِ انتظام سے ملک میں امن وامان اور خوش حالی کا دور دورہ ہے سرکشوں کی سرکوبی کی جا چکی ہے۔ ملک کافور نے فتوحات کے جھنڈے گاڑ دیے ہیں۔

علا لدین:۔ سلطنت صرف ملکوں کی فتح کا ہی نام نہیں ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ تحصیلِ علم کے لیے طالب علموں کی ہمت افزائی کی جائے۔ علمی کتابوں کی اشاعت پر زور دیا جائے۔ عوام کے اخلاق کا معیار بلند کرنے کے لیے تمام ممکن اقدامات کیے جائیں۔

خواجہ :۔ جہاں پناہ کے حکم سے شراب نوشی پر پابندی عائد کر دی گئی ہے۔ قحبہ خانوں کا وجود مٹا دیا گیا ہے۔ اب لوگوں کو چوری کرنے کی ہمت نہیں ہوتی ـــــ رعایا میں پاکیزہ زندگی گزارنے کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے۔

علاالدین:۔ ہمارے دورِ سلطنت کی پہچان ہونی چاہیے ـــــ انصاف۔ انصاف کے دروازے ہر کس و ناکس کے لیے کھلے ہونے چاہئیں۔ یاد رکھو، ہم سخت گیری کے قائل نہیں لیکن ثابت قدمی ہمارا مزاج ہے۔ اور ہم اس دن اپنے آپ کو معاف نہیں کریں گے جب ہمارے پائے استقلال میں لغزش آجائے۔

دربان :۔ شاعر امیر خسرو باریابی کی اجازت چاہتے ہیں۔

علاالدین:۔ اس وقت! (دونوں کو دیکھتا ہے) اجازت ہے۔

(امیر خسرو نہایت ادب سے داخل ہوتے ہیں اور ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں)

علاالدین:۔ کہیے ـــــ کوئی نئی غزل کہی ہے آپ نے۔

خسرو :۔ ایک مطلع ہوا ہے۔

کافرِ عشقم مسلمانی مرا درکار نیست
ہر رگِ جاکہ تار گشتہ حاجتِ زنار نیست

علاالدین:۔ سبحان اللہ۔ آپ کی شاعری میں تصوف کا رنگ نکھرتا جا رہا ہے۔

خسرو :۔ ذرہ نوازی ہے ـــــ یہ ناچیز کچھ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہے۔

علاالدین:۔ اجازت ہے۔

امیر خسرو:۔ ظلِ سبحانی! یہ ناچیز امیر خسرو ایک زمانے سے دربارِ دہلی سے وابستہ ہے، اور ہر زمانے میں اپنے فن کی داد پاتا رہا ہے۔ بندہ شاعر بھی ہے اور موسیقار بھی۔ خود ستائی نہ تصوّر کی جائے تو عرض کروں کہ میری شاعری فردوسی اور عنصری سے کم تر درجے کی نہیں ـــــ مگر اپنے اپنے زمانے میں ان شعرا کی جو قدر افزائی ہوئی بندہ اس سے محروم ہے۔ عالم پناہ! گھاس اس وقت سرسبز ہوتی ہے جب ابرِ رحمت برسے اور شاعری اس وقت معراج کو پہنچتی ہے جب بادشاہ کی نوازش ہو۔

علاالدین:۔ شاعرانہ خیال ہے۔ آپ مصحف دار کے عہدے پر فائز ہیں۔ آپ اپنے فرائضِ منصبی میں دلچسپی لیں اور دربارِ شاہی کی حاضری میں پابندیٔ وقت کا خیال رکھیں۔

خسرو :۔ (سرِ تسلیم خم کر کے) گستاخی معاف عالم پناہ! حضور کے سامنے روز سیکڑوں سر جھکتے ہیں۔ اگر کسی دن یہ ناچیز غیر حاضری کی گستاخی کرے تو یہ تصوّر کر کے درگزر کر دیا جائے کہ وہ وقت سنگیت کے ریاض اور فکرِ سخن کے لیے درکار ہے۔ پابندی کے ساتھ دربار کی حاضری سے میرے فن پر زوال آنے کا اندیشہ ہے۔ شاید اس صورت میں شاعری کے وہ اعلیٰ جواہر پارے نہ پیش کر سکوں گا جن کی مدح شہنشاہ کے لیے ضرورت ہے۔ ناچیز کو خصوصی مراعات دی جائیں۔

علاالدین :۔ فی الحال خصوصی مراعات منظور نہیں دی جا سکیں اور ہدایت کی جاتی ہے کہ آدابِ شاہی کا لحاظ رکھا جائے۔

(علاءالدین تخت سے کھڑا ہو جاتا ہے اور سب درباری مؤدب کھڑے ہو جاتے ہیں۔ علاءالدین چلے جاتے ہیں اور درباری بھی منتشر ہو جاتے ہیں۔ خواجہ خطیر امیر خسرو پر معنی خیز نظر ڈالتا ہے۔ خسرو کے چہرے پر الجھن اور ناگواری کے آثار ہیں۔ وہ گویا اپنے آپ سے اپنے تاثرات بیان کرتے ہیں)

خسرو :۔ تمام عمر کی خدمت گزاری کا یہ انجام ——! وہ کونسا منحوس دن تھا جب میں نے شاہی ملازمت اختیار کی تھی کس کس کی مدح سرائی نہ کی، کس کس کی شان میں قصیدے نہ لکھے۔ آج اپنی اس مبالغہ آرائی اور جھوٹ کے پلندے پر شرمندہ ہوں۔ مجھ جیسے شاہی مصوف دار سے تو وہ غریب اور آزاد مزدور کہیں اچھا جو محنت مشقت کر کے اپنی روزی کماتا ہے۔ اپنی نیند سوتا ہے اور اپنے حساب سے جاگتا ہے۔ میں نے جتنی خدمت سلاطینِ دہلی کی کی اگر اتنی خدمت محبوب الٰہی کی کرتا تو میرا قلب روشن ہو چکا ہوتا۔ آج میرا ضمیر مجھ پر ملامت کر رہا ہے کہ خسرو تو نے کیا کیا عمرِ عزیز تاج و تخت کے بھوکے شہزادوں اور بادشاہوں کی قصیدہ خوانی میں گزار دی۔ افسوس۔

(خسرو تصویرِ حسرت بنے کھڑے ہیں۔ روشنیاں گل ہو جاتی ہیں)

(۹)

(اسٹیج پر روشنی ہوتی ہے تو خسرو کا گھر ہے اور وہ ستار پر ریاض کر رہے ہیں۔
ایک شاگرد قریب بیٹھا ہے جو محویت کے عالم میں ان کی ستار نوازی کو دیکھ رہا ہے۔)

شاگرد :۔ (ستار کی آواز رک جانے کے بعد) واہ استاد، سبحان اللہ۔

خسرو :۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ یہ روح کا ساز ہے ـــــ دل کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔

شاگرد :۔ آپ کی یہ ایجاد تو سنگیت کی دنیا کا ایک کرشمہ ہے۔

خسرو :۔ تم دیکھ رہے ہو اس کے یہ تار۔ اس میں تین تار تو بنیادی حیثیت رکھتے ہیں ـــــ
پہلا تار "سا" کا ہے (تار چھیڑتا ہے) دوسرا تار "پا" کا ہے، پنچم کا۔ اور تیسرا تار ہے کھرج کا۔

شاگرد :۔ (اپنی ستار پر تار چھیڑتے ہوئے) اور باقی تار۔

خسرو :۔ باقی تار صرف جھنکار کے لیے ہیں۔ طربوں کی شکل میں

(خسرو پھر ستار بجانے لگتے ہیں)

شاگرد :۔ واہ واہ استاد ـــــ سبحان اللہ۔

حسن سجزی :۔ (داخل ہوتے ہیں) کیا سوچ رہے ہو بھئی۔

خسرو :۔ آؤ حسن، تم بہت اچھے وقت پر آئے۔ میں بہت اداس تھا۔

حسن :۔ کیوں ؟

خسرو :۔ کوئی خاص وجہ بھی نہیں ـــــ بس یونہی۔

شاگرد :۔ اچھا استاد، مجھے اجازت دیں۔

خسرو :۔ اچھا۔

(شاگرد آداب کر کے چلا جاتا ہے)

خسرو :۔ میں سوچ رہا ہوں ہم لوگوں کی کیا حیثیت ہے شاہی دربار میں ـــــ شاعری اور موسیقی کا اپنا ایک مقام ہے، مگر مجھے اس روز بادشاہ کے پاس جا کر اپنی ناقدری کا احساس ہوا۔ آخر ایک عام درباری اور ہم میں کیا فرق ہے۔

حسن :۔ کوئی فرق نہیں۔

خسرو :۔ مگر فرق ہے۔ ایک عام درباری کو دربار اٹھ جانے کے بعد کسی قسم کی فکر نہیں ہوتی وہ تو چین کی بنسی بجاتا ہے۔ مگر ہمیں اپنا خونِ جگر صرف کر کے شہنشاہ کے قصیدے لکھنے پڑتے ہیں، اور پھر بھی ہمیں کوئی مراعات نہیں دی جا سکتیں

حسن :۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔ اور اس پر طرہ یہ کہ اس بے عزتی کے زہر کو ہنستے ہنستے پینا پڑتا ہے ـــــ ایسے ماحول میں اگر پیر و مرشد حضرت نظام الدین اولیا کا سہارا نہ ہوتا تو میں تو پاگل ہو گیا ہوتا۔

خسرو :۔ اس دن دربار کے بعد مرشد کے پاس جا کر بڑا سکون ملا۔ ایک عجیب کیفیت تھی۔

حسن :۔ مجھے تم پر رشک آ رہا ہے۔

خسرو :۔ کیوں!

حسن :۔ پیر و مرشد فرما رہے تھے کہ اگر خدا مجھ سے قیامت کے دن پوچھے گا کہ تو کیا لایا تو میں کہوں گا امیر خسرو کا سوز۔

خسرو :۔ (خوش ہو کر) ایسا فرمایا پیر و مرشد نے ـــــ بھائی میں تو بچپن ہی سے ان کا عقیدتمند ہوں، یہ سب کچھ ان کی توجہ کا طفیل ہے ـــــ اور اب تو میں نے طے کیا ہے کہ ان کا ہی ہو رہوں۔ ان کے قدموں سے اٹھ کر کہیں نہ جاؤں اب اس دن کی قدمبوسی کے بعد میرے دل پر ایک عجیب کیفیت طاری ہے۔

حسن :۔ یہ کیفیت تمہارے اونچے روحانی مراتب کی غماز ہے۔

خسرو :۔ پیر و مرشد کا حکم ہے کہ میں ترکِ دنیا نہ کروں اس لیے دربار داری بھی جاری ہے اور گھر گرہستی بھی ـــــ ادھر اللہ سے واصل، ادھر مخلوق میں شامل۔"

حسن :۔ شاید یہ متوازن زندگی گزارنا دنیا سے الگ ہو کر ایک گوشے میں بیٹھے رہنے سے زیادہ مشکل ہے۔ تم واقعی قابلِ تعریف ہو۔

خسرو :۔ دوست تم آ گئے تو دو باتیں کر کے جی ہلکا ہو گیا۔

حسن :۔ اچھا اب چلتا ہوں، خانقاہ جا رہا تھا ـــــ چلنا ہے۔

خسرو :۔ تم چلو ـــــ میں کچھ دیر بعد آؤں گا۔

(حسن سجزی چلا جاتا ہے)

خسرو :۔ (پھر ستار چھیڑ دیتا ہے۔ اور ایک منٹ بعد ستار ایک طرف رکھ کر سوچ میں غرق ہو جاتا ہے) اف ـــــ زندگی نے مجھے کتنا مجبور اور تنہا کر دیا ہے ـــــ یہ سال کتنا منحوس ہے کہ ماں کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ (دیوانہ وار) ماں! تو کہاں ہے ـــــ اب میں تجھے نہیں دیکھ سکتا۔ میرے آنسوؤں پر رحم کر۔ اور مسکراتی ہوئی قبر سے نکل آ۔ ماں! میں نے تیری شان میں نہ جانے کیا کیا گستاخیاں کی ہیں، اور اب کفِ افسوس ملتا ہوں ـــــ آج میں کتنا شرمسار ہوں۔ اور میرا قوتِ بازو حسام الدین قتلغ بھی گیا، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مجھ سے جدا ہو گیا اور بیٹوں کا غم تو دل میں ناسور بن گیا ہے ـــــ

بہو :۔ (اندر سے باہر آتے ہوئے) یہ آپ نے اپنا کیا حال بنا رکھا ہے۔

خسرو :۔ جی چاہتا ہے جنگل میں نکل جاؤں۔

بہو :۔ اور ہم لوگوں کو کس کے سہارے چھوڑ جاؤ گے۔ بچوں کا کیا ہو گا۔

خسرو :۔ یہی تو وہ زنجیریں ہیں جنھوں نے مجھے سرکاری نوکری سے باندھ رکھا ہے۔

بہو :۔ عفیفہ تو ہر وقت آپ کی مالا جپتی ہے اور امیر احمد تو بالکل آپ کے نقشِ قدم پر چل رہا ہے آپ ہی جیسی آواز۔ اور بالکل آپ کے انداز میں شعر پڑھتا ہے۔

خسرو :۔ کہاں ہے وہ۔ میں اس سے کہنا چاہتا ہوں کہ دنیا کے لالچ، اور دولت کے طمع سے ہمیشہ دور رہے ـــــ

عفیفہ :۔ (باہر سے آتے ہوئے) ابّا۔

بہو :۔ لیجیے وہ آگئی عفیفہ۔

خسرو :۔ آؤ بیٹی ـــــ (اسے گود میں بھر لیتا ہے) میں تمھیں دیکھ کر رنجیدہ ہو جاتا ہوں۔

عفیفہ :۔ (حیرت اور معصومیت سے) کیوں؟

خسرو :۔ یہ زمانہ ـــــ یہ سماج ـــــ عورت کی قدر نہیں کرتا ـــــ بیٹی! زندگی میں کبھی محنت مشقت سے منہ نہ موڑنا ـــــ چرخہ کاتنا کبھی نہ چھوڑنا ـــــ نیک چلنی کو اپنا شعار بنانا۔ کبھی گھر کے دریچوں سے باہر نہ جھانکنا۔

بہو :۔ یہ سب باتیں آپ اس بچی سے کیوں کہہ رہے ہیں اس وقت ـــــ جاؤ بیٹی کھیلو۔

(عفیفہ حیران ہے۔ وہ باہر چلی جاتی ہے)

خسرو :۔ صحیح بات کہنے کے لیے ہر وقت مناسب ہوتا ہے ـــــ اور پھر وقت ملے، نہ ملے۔

بہو :۔ ایسے کہاں جا رہے ہیں آپ۔

خسرو :۔ کہاں جا سکتا ہوں۔ رہوں گا تو اسی گھر اور اسی بادشاہ کے دربار میں ـــــ مگر میرا دل اس ظاہر داری سے بیزار ہو چکا ہے۔ جن بزرگ نے بچپن سے میرے دل میں سوز و گداز بھر دیا ہے اب انھوں نے مخصوص نظرِ کرم کی ہے اور میں نے مضبوطی سے ان کا دامن پکڑا ہے۔ اب میرا ایک ایک پل اپنے پیر و مرشد کے لیے ہے ـــــ اب مجھے نہ کسی کی پشت پناہی کی ضرورت ہے نہ امان کی۔ میں نے اپنے آقا اور مالک کی طرف رجحان کر لیا ہے۔ سبحان اللہ! کیا نورانی محفل ہوتی ہے۔ حضرت نظام الدین جیسے پیر و مرشد، حسن سجزی اور نصیر الدین چراغ جیسے دوست اور ہم مشرب۔ پھر نہ کسی کی غیبت، نہ بُرائی، نہ سازشیں، نہ سیاست گری ـــــ ہر وقت اس معبودِ حقیقی کا ذکر ـــــ ایک عجیب روحانی کیفیت ـــــ ایک وجد کا عالم۔ ایک بے اختیاری۔ ایک سرشاری۔ ساری عمر تھپیڑے کھانے کے بعد آخر زندگی کی کشتی کو ساحل مل گیا ـــــ ایک نور کا عالم۔

"اے چہرۂ زیبائے تو رشکِ بتانِ آذری
توری صورت کے بلہاری نجام"

(خسرو جیسے خلا میں گھور رہے ہیں ایک عجیب کیف و سرمستی کے عالم میں۔ بہو ان کو ایک ٹک دیکھے جا رہی ہے)

خسرو :۔ "توری صورت کے بلہاری نجام"

(خسرو جذب و کیف کے عالم میں ہیں۔ جیسے ان کی روح کسی عجیب و غریب روحانی تجربے سے دوچار ہو رہی ہو۔ ان کی آنکھوں میں ایک عجیب عارفانہ چمک آجاتی ہے اور زبان پر بے ساختہ یہ الفاظ آتے ہیں)

خسرو :۔
چھاپ تلک سب چھینی رے
توسے نینا ملا کے
نینا ملا کے، نینا لڑا کے

اپنی سی کر لینی رے
توسے نینا ملاکے
چھاپ تلک سب چھینی رے ، توسے نینا ملاکے
متوالی کر لینی ۔ توسے نینا ملاکے
خسرو نجام کے بل بل جاؤں
موہے سہاگن کینی رے
توسے نینا ملاکے
چھاپ تلک سب چھینی رے
توسے نینا ملاکے

(خسرو اس گیت میں محو، جذب و کیف کے عالم میں ہیں۔ اسٹیج کی روشنیاں گل ہو جاتی ہیں)

●

(۱۰)

(اسٹیج پر روشنی ہے تو خانقاہِ چشتیہ کا منظر ہے۔ چٹائیاں بچھی ہوئی ہیں۔ بیچ میں ایک بڑی شمع روشن ہے۔ اور خسرو، حسن سجزی اور کچھ اور صوفی رقص کی کیفیت میں ہیں ـــــ ایک گوشے میں قوال خسرو کا کلام پیش کر رہے ہیں)

قوال :۔ اے چہرۂ زیبائے تو رشکِ بتانِ آذری
ہر چند وصفت می کنم در حسن زاں زیبا تری
من تو شدم تو من شدم من جاں شدم تو تن شدی
تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

توری صورت کے بلہاری نجام
توری صورت کے بلہاری نجام
اب کے بار چنری موری رنگ دے
رکھ لے لاج ہماری نجام
توری صورت کے بلہاری نجام
صدقہ بابا گنج شکر کا، رکھیو لاج ہماری
نجام توری صورت کے بلہاری
قطب، فرید مل آئے براتی
خسرو راج دلاری
نجام توری صورت کے بلہاری
توری صورت کے بلہاری نجام

(قوالی پر رقص جاری ہے ـــــ پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے)

●

مصوّر

کردار:۔

● ساجد۔	ایک مصوّر
● شاہدہ۔	ساجد کی بیوی
● راشدہ۔	شاہدہ کی بڑی بہن
● ایک عورت۔	ساجد کی ایک قدردان
● سیٹھ۔	ایک تاجر

"چلی گئی ـــــ شاہدہ بھی چلی گئی۔ آج وہ طلسم بھی ٹوٹ گیا کہ بیوی شریکِ حیات ہوتی ہے۔ نہ ماں باپ نہ بھائی بہن، نہ محبوبہ نہ بیوی، کوئی شریکِ غم نہیں ہوتا۔ انسان کا غمگسار ہوتا ہے صرف اس کا فن۔ فن جو روح میں ہے، فن جو زندگی کی دھڑکن ہے۔ میری یہ تصویریں میرے دکھ سکھ کی ساتھی ہیں۔ ان میں میری زندگی کے لمحے قید ہیں۔ اے میرے شاہکارو! میرے قریب آجاؤ ـــــ مجھ سے سرگوشیاں کرو۔"

(اس ڈرامے کا ایک اقتباس)

مصوّر

(ایک بڑا کمرہ جو بہ یک وقت ڈرائنگ روم بھی ہے اور ایک آرٹسٹ کا اسٹوڈیو بھی۔ ایک طرف صاف ستھرا صوفہ سیٹ ہے۔ کھڑکیوں اور دروازوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں۔ دیواروں پر کچھ تصویریں لگی ہوئی ہیں، جو تجریدی آرٹ کے نمونے معلوم ہوتی ہیں۔ ایک طرف بورڈ پر کینوس لگا ہوا ہے اور ایک نوجوان آرٹسٹ برش ہاتھ میں لیے پینٹنگ کرنے میں محو ہے۔ تصویر ادھوری ہے۔ ایک عورت کے آڑے ترچھے خدوخال ابھرے ہوئے نظر آرہے ہیں ـــــ مصور سوچ سوچ کر برش چلا رہا ہے۔ اس کی پشت نظر آرہی ہے۔ اور اس کے لمبے اور بکھرے بالوں سے اس کے لاابالی پن کا اندازہ ہوتا ہے ـــــ وہ سوچنے کے انداز میں بولتا ہے۔)

ساجد :- ہوں ـــــ ٹھیک ہے ـــــ اس عورت کی ایک ہی آنکھ ہونی چاہیے ـــــ مگر ماتھے پر ـــــ ہوں ـــــ (پھر برش چلاتا ہے) اور ہاتھ ـــــ یہ ہاتھ اور لمبا ہونا چاہیے ـــــ اور یہ ہاتھ ـــــ بس۔ اتنا ہی ٹھیک ہے ـــــ نہیں ـــــ اور بھی چھوٹا ـــــ ہوں ـــــ (برش چلاتا رہتا ہے۔)

اور یہ جال ـــــ کتنا خوبصورت بنا ہے ـــــ زندگی کی طرح مکروفریب کا جال ـــــ مکڑی کے اس جال میں۔ یہ مکھی ـــــ آہاہا ـــــ اب اس کا نکلنا

مشکل ہے۔ (ہنستا ہے)

(ایک نہایت خوبصورت عورت، مگر اپنے آپ سے بے نیاز ـــــ گھریلو لباس میں ملبوس۔ چہرہ پر ناگواری کے آثار لیے داخل ہوتی ہے)

شاہدہ :۔ مکھی تو کیا مگر معلوم ہوتا ہے اس جال میں ایک عورت ضرور پھنس گئی ہے۔

ساجد :۔ (برش ہاتھ میں لیے ایک دم پلٹ کر دیکھتا ہے۔) وہ کون؟

شاہدہ :۔ میں ـــــ!

ساجد :۔ افوہ ـــــ کیا خیال پیش کیا ہے!

شاہدہ :۔ میں خیال نہیں چائے پیش کر رہی ہوں۔ کچھ خبر ہے کہ دن چڑھ آیا ہے اور جناب ہیں کہ نہ منہ دھویا ہے نہ ہاتھ؟ بس صبح سے کیرم کاٹ کر رہے ہیں۔

ساجد :۔ تم میری تصویروں کو کیرم کاٹ کہتی ہو؟ کاش ـــــ

شاہدہ :۔ کاش ان آڑی ترچھی لکیروں کو عورت کہہ سکتی۔ یہی نا ـــــ چلیے مان لیا۔ آپ نے ایک نہایت خوبصورت اور لاثانی عورت کی تصویر بنائی ہے۔ معلوم ہو گیا آپ کی نظر میں حسین عورت کسے کہتے ہیں۔ اب اٹھیے چائے پیجیے۔

ساجد :۔ چائے ـــــ ہاں چائے سے مجھے کوئی بَیر نہیں (ایک گھونٹ پی کر) لیکن ـــــ

شاہدہ :۔ لیکن مجھ سے بَیر ہے۔ مجھ سے نفرت ہے۔

ساجد :۔ (چائے کا گھونٹ پی کر) نہیں ـــــ یہ میں نے کب کہا۔

شاہدہ :۔ ہر وقت کہتے ہو۔ تمہارے رویّے سے۔ تمہاری باتوں سے صاف ظاہر ہے کہ تمھیں میرے وجود کی ضرورت نہیں تھی۔ میں تو گویا ایک حادثہ کی طرح تمہاری زندگی میں آگئی ہوں اور بے زبان جانور کی طرح تمھارے گھر میں ہوں۔

ساجد :۔ تم بے زبان ہو؟ ماشاء اللہ۔ میرے خیال میں تم صرف زبان ہو۔ آہا ـــــ کیا عمدہ خیال ہے! کتنا شاندار تصویر بن سکتی ہے۔ عورت ایک زبان ـــــ باقی تمام خدوخال دھندلے دھندلے سے کھوئے کھوئے۔ بس زبان ـــــ صرف زبان نمایاں ـــــ پوری روح۔ پوری زندگی کھنچ کر زبان میں آجائے۔ بہت انوکھی تصویر بن سکتی ہے۔

شاہدہ :۔ بس کیجیے ـــــ بے عزتی کرنے کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ میرا ہی دل جانتا ہے اس گھر میں جس طرح زندگی گزار رہی ہوں ـــــ ایک تمھاری بے کاری کا غم اور اس

پر تمھاری جلی کٹی باتیں۔ نہ جانے ماں باپ نے کیا دیکھا تھا؟

ساجد :- تمھارے ماں باپ نے تو تمھارے لیے ایک پڑھا لکھا اور برسرِ روزگار نوجوان تلاش کیا تھا ــــــ اب یہ تمھاری قسمت کہ اِدھر تم سے شادی ہوئی اُدھر میں بے روزگار ہو گیا۔

شاہدہ :- اس بے روزگاری کے لیے میری قسمت کو کیوں بُرا کہتے ہو؟ سب تمھارے کیے کی سزا ہے۔ جو آدمی مہینے میں بیس دن گھر ہی بیٹھا رہے گا اس کی نوکری کیسے برقرار رہ سکتی ہے؟

ساجد :- وہ کوئی نوکری تھی کہ سارا دن کوڑھ مغز لڑکوں کو یہ سکھاتے رہو کہ لکیر کیسے کھینچنی چاہیے اتنی دیر اگر میں خود رنگ اور برش لے کر بیٹھوں تو ــــــ

شاہدہ :- تو کیا ہو؟ یہ تو میں دیکھ رہی ہوں۔

سا :- اب اس کا کیا علاج کہ زمانہ فن کی قدر نہیں جانتا؟ ورنہ میری ایک تصویر ــــــ

شاہدہ :- موتیوں میں تولنے کے لائق ہے۔ اپنے منہ میاں مٹھو بننا کوئی تم سے سیکھے۔ اور یہ حال اُس وقت ہے جب میاں کی بنائی ہوئی تصویروں کو دیمک چاٹ رہی ہے۔

ساجد :- میری تصویروں ہی کو کیا؟ اس سماج کو دیمک چاٹ رہی ہے۔

شاہدہ :- یہ جملہ میں سیکڑوں بار سن چکی ہوں۔ میں کہتی ہوں فضول باتوں سے کیا فائدہ؟ اگر تم کہیں نوکری نہیں کرنا چاہتے تو ایسی تصویریں ہی بناؤ جن سے کچھ پیسے ملیں۔ لوگوں کی بنائی ہوئی تصویریں ہزاروں روپیوں میں بکتی ہیں اور ایک تم ہو کہ اپنی بنائی ہوئی تصویر خود ہی دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے رہتے ہو۔

ساجد :- شاہدہ، تمھیں کیسے سمجھاؤں کہ جس فن کی تخلیق روپیہ کمانے کے خیال سے کی جاتی ہے وہ اعلیٰ فن نہیں ہوتا؟

شاہدہ :- تو اعلیٰ فن کار ہمیشہ بھوکوں ہی مرتا ہے؟

ساجد :- نہیں ایسا بھی نہیں ہے۔ لیکن ــــــ

شاہدہ :- لیکن اس کی بیوی کی قسمت میں جلنا ضرور لکھا ہوتا ہے۔

ساجد :- یہ نہیں کہتیں کہ فن کار ہمیشہ قسمت والوں کو ہی ملتا ہے۔ سچ بتاؤ شاہدہ، تمھیں اپنی قسمت پر ناز نہیں ہوتا کہ تم ایک مصوّر کے دل کی ملکہ ہو۔ میں نے نہ جانے تمھاری

کتنی تصویریں بنائی ہیں اور وہ تصویر تو میرا شاہکار ہے، جس میں میں نے تمھاری آنکھوں کے حسن کو اجاگر کیا ہے۔

شاہدہ :۔ وہ جس میں ایک عورت کے چہرہ پر ایک آنکھ کے بجائے نرگس کا پھول ہے۔ اور دوسری کی جگہ شراب کا پیالہ۔

ساجد :۔ ہاں ہاں وہی۔ تم اداس کیوں ہوگئیں۔

شاہدہ :۔ تم اس تصویر کو دوبارہ بناؤ اور اس کے ہاتھ میں ایک بھیک کا پیالہ دے دو۔

ساجد :۔ شاہدہ، یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟

شاہدہ :۔ وہی، جس کے آثار نظر آرہے ہیں۔ اب مجھے تمھاری فن کارانہ باتوں میں کوئی دلچسپی نظر نہیں آتی۔ تم کئی مہینے سے بے کار ہو۔ پاس کا پیسہ خرچ ہوگیا۔ اب گھر کا سامان آہستہ آہستہ بکتا جا رہا ہے۔ زیور بکنے کی نوبت آگئی ہے اور مجھے یہ فکر کھائے جاتی ہے کہ جب یہ سہارا بھی ختم ہو جائے گا تو پھر کیا ہوگا۔ میں کس کے آگے ہاتھ پھیلاؤں گی۔ شادی کے بعد ماں باپ کے آگے ہاتھ پھیلانا عورت کی سب سے بڑی توہین ہے۔

ساجد :۔ سدا یہ دن نہیں رہیں گے ـــــ میری تصویریں۔

شاہدہ :۔ تصویریں ـــــ تصویریں ـــــ تصویریں۔ میں تو سمجھتی ہوں کہ یہ بے کاری تمھارے فن کو بھی چاٹ رہی ہے۔

ساجد :۔ کیا مطلب ـــــ ؟

شاہدہ :۔ مطلب صاف ہے۔ بتاؤ ان دنوں تم نے کوئی نئی تصویر بنائی ہے۔ سوائے "دیوانے کا خواب" کے۔

ساجد :۔ وہ ایک ہی تصویر ہزاروں تصویروں پر بھاری ہے اور شاہدہ تم مصوّر کے دل کو نہیں سمجھ سکتیں۔ ایک طوفان ہے جو میرے دل میں پل رہا ہے۔ سمندر کی سطح خاموش ہو تو سمجھ لو کہ طوفان کے آثار ہیں۔ اس وقتی خاموشی کے بعد میں جو تصویریں بناؤں گا وہ مصوّری کی دنیا میں تہلکہ مچا دیں گی۔ اور "دیوانے کا خواب"! ذرا وہ تصویر چھپ تو جائے۔ لوگ دیکھ کر دیوانے ہو جائیں گے۔

شاہدہ :۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔

ڈاکیہ :۔ (صرف آواز آتی ہے) خط لے لیجیے۔

ساجد :۔ ذرا دیکھنا کس کا خط ہے؟ (اور پھر برش اٹھا کر رنگ بھرنا شروع کر دیتا ہے)

شاہدہ :۔ نجی ہی ہوں ______ تصویرستان کے ایڈیٹر کا۔

ساجد :۔ دیکھا۔ میں نہ کہتا تھا کہ "دیوانے کا خواب" پردیسی صاحب کو ضرور پسند آئے گی ______ کتنے روپے کا چیک بھیجا ہے۔ میں نے لکھ دیا تھا معاوضہ ایڈوانس لوں گا۔

شاہدہ :۔ منہ دھو کر بیٹھیے ______ آپ کی تصویر "دیوانے کا خواب" واپس آئی ہے۔

ساجد :۔ ہیں ______ واپس آئی ہے (برش ہاتھ سے گر جاتا ہے)

شاہدہ :۔ جی ہاں لکھا ہے ______ ایسی اوٹ پٹانگ تصویریں ہمارے رسالے میں نہیں چھپتیں ابھی آپ اور مشق کیجیے۔

ساجد :۔ بکواس ______

شاہدہ :۔ لیجیے ______ "دیوانے کا خواب" آپ بھی دیکھیے۔

ساجد :۔ تم میری تصویر کا مذاق اڑانے کی کوشش نہ کرو۔ چاند پر کوئی گرد نہیں ڈال سکتا۔ یہ تصویر شاہکار ہے۔ آج نہیں تو کل دنیا اسے سمجھے گی۔

شاہدہ :۔ فی الحال تو تم دنیا کو سمجھنے کی کوشش کرو۔

ساجد :۔ میں فن کار ہوں۔ مجھے اس معاملہ بندی کی ضرورت نہیں۔

"جہاں ہے میرے لیے، میں نہیں جہاں کے لیے"

شاہدہ :۔ جہاں کے لیے نہ سہی، اپنے لیے، اپنی عزت کے لیے تو کچھ کرو۔ یوں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنے سے کیا ہوگا؟ اب بھی مان جاؤ۔ اور چچا جان کو خط لکھ دو کہ میری نوکری چھوٹ گئی ہے۔

ساجد :۔ وہ نوکری میں نے خود چھوڑی ہے۔

شاہدہ :۔ اچھا یوں ہی سہی ______ بہر حال اب تم انھیں لکھ دو کہ میں آپ کے فرم میں کام کرنے کے لیے تیار ہوں۔

ساجد :۔ میں بالکل تیار نہیں ہوں۔ میں ایسی نوکری نہیں کرنا چاہتا جس میں میری فن کارانہ صلاحیتیں ختم ہو جائیں اور جو میرے فن کو موت کی نیند سلا دے۔

شاہدہ :۔ لیکن تم نوکری نہیں کرو گے تو پیسہ کہاں سے آئے گا؟ اور پیسہ نہیں آئے گا تو گھر میں اناج نہیں آئے گا، مکان کا کرایہ نہیں دیا جائے گا۔

ساجد :۔ تو تم چاہتی ہو کہ میں چند سکّوں کی خاطر کاغذ کا کیڑا بن جاؤں۔

شاہدہ :۔ اور تم جانتے ہو کہ تنگ دستی سے مجھے نفرت ہے۔

ساجد :۔ تو تم مجھے چھوڑ کر جا سکتی ہو ـــــــ تم نے زندگی میں آکر میرے فن کو گھُن لگا دیا ہے۔ میرے دل و دماغ مجھے کہیں اور لے جانا چاہتے ہیں اور تم مجھے اس گھر کے اول جلول تقاضوں کی طرف دھکیلنا چاہتی ہو۔ تمہیں سونے چاندی کی چمک دمک پسند ہے۔ پُرسکون ماحول پسند ہے اور میری زندگی ہے ایک طوفان۔ میرے دل میں ہے فن کا جوالا مکھی۔

شاہدہ :۔ تمھارے فن کا جوالا مکھی ایک دن مجھے جلا کر خاک کر دے گا۔

ساجد :۔ تو چلی جاؤ ـــــ چلی جاؤ ـــــ اس جوالا مکھی سے دور ـــــ

شاہدہ :۔ نہیں نہیں ـــــ

راشدہ :۔ (تیزی سے داخل ہوتی ہے) ہاں ہاں یہ چلی جائے گی۔ آج ہی چلی جائے گی۔

شاہدہ :۔ کون ـــــ؟ راشدہ باجی ـــــ!

راشدہ :۔ ہاں ـــــ یہ کیا بیہودگی ہے؟ سڑک تک تم لوگوں کے بولنے کی آواز جا رہی ہے۔ یہ تہذیب ہے؟

ساجد :۔ میں ایسی باتیں سننے کا عادی نہیں ہوں۔

راشدہ :۔ تو ہم کب عادی ہیں ایسے لوگوں کی باتیں سننے کے ـــــ کیا تم نے اسے لاوارث سمجھا ہے۔ ابھی اس کے ماں باپ زندہ ہیں۔ کیا ہم نے اس لیے شادی کی تھی کہ تم اسے یوں جلا جلا کر مارو!! گھر میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہو اور بیوی کا جہیز اور زیور بیچ بیچ کر کھاتے رہو۔

ساجد :۔ آپ اگر مجھے اتنا ہی نیچ سمجھتی ہیں تو مجھ سے شادی ہی کیوں کی تھی اپنی بہن کی؟

راشدہ :۔ شرافت اور رذالت کسی کے ماتھے پر نہیں لکھی ہوتی۔ برتنے کے بعد ہی آدمی کی حقیقت معلوم ہوتی ہے۔

شاہدہ :۔ بس چپ ہو جائیے باجی!

راشدہ :۔ کیوں چپ ہو جاؤں؟ ـــــ آخر برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے شاہدہ! تجھے ابھی میرے ساتھ چلنا ہو گا۔

شاہدہ :- نہیں باجی ــــــ میں اس طرح نہیں جاؤں گی انھیں اکیلا چھوڑ کر۔

ساجد :- ہاں، یہ کیوں جائے گی۔ یہ جونک کی طرح میرے فن کا خون چوسنے آئی ہے۔

راشدہ :- ساجد!

ساجد :- اس عورت نے آج تک میری ایک بھی تصویر کی تعریف نہیں کی۔ جب سے شادی ہوئی ہے میں ایسا محسوس کر رہا ہوں کہ میرا فن پستی کے غاروں میں اُتر جا رہا ہے۔

راشدہ :- نہیں ــــــ تم بلندی کے پہاڑ پر چڑھو۔ لیکن ہماری بہن کو زندہ درگور نہ کرو۔

ساجد :- میں آپ کی بہن کو نہیں روکنا چاہتا۔ آپ اسے لے جانا چاہتی ہیں تو شوق سے لے جائیے! مجھے زندگی میں کب خوشی ملی ہے جو آج اس کی آرزو کروں ــــــ تم جاؤ ــــــ اور مجھے زندگی کے کانٹوں پر تڑپنے کے لیے اکیلا چھوڑ دو۔

راشدہ :- ہاں تمھیں اکیلا ہی چھوڑا جائے گا۔ چلو شاہدہ ابھی۔

(راشدہ شاہدہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے تیزی سے باہر لے جاتی ہے اور ساجد خالی خالی آنکھوں سے دیکھتا رہ جاتا ہے)

ساجد :- چلی گئی ــــــ شاہدہ بھی چلی گئی۔ آج وہ طلسم بھی ٹوٹ گیا کہ بیوی شریکِ حیات ہوتی ہے۔ نہ ماں باپ نہ بھائی بہن، نہ محبوبہ نہ بیوی، کوئی شریکِ غم نہیں ہوتا۔ انسان کا غم گسار ہوتا ہے صرف اس کا فن۔ فن جو روح میں ہے، فن جو زندگی کے دل کی دھڑکن ہے۔ میری یہ تصویریں میرے دُکھ سکھ کی ساتھی ہیں۔ ان میں میری زندگی کے لمحے قید ہیں۔ اے میرے شاہکارو! میرے قریب آجاؤ ــــــ مجھ سے سرگوشیاں کرو۔ (وہ اپنی بنائی ہوئی تصویریں الٹنے پلٹنے لگتا ہے)

میرے نگار خانے کی پریو! مجھے خاموش نغمے سناؤ تم ــــــ ہاں تم کیوں مسکرا رہی ہو۔ تم نجمہ کے چہرہ کا نہیں، اُس کے پُر فریب دل کا عکس ہو۔ میں نے تمھاری پرفریب مسکراہٹ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے فن کی دنیا میں قید کر لیا ہے۔ اور تم ــــــ! بیگم زاہدہ تم ــــــ! (ہنس کر) تم سمجھتی تھیں کہ تم باعزت صاحب ثروت اور اونچے طبقہ کی بلند کردار عورت ہو۔ لیکن میں نے ــــــ میں نے تمھاری ظاہری شان و شوکت اور خوبصورتی کے پس پردہ تمھاری گھناؤنی روح کو بے نقاب دیکھا ہے۔ تم مجھے۔ میرے فن کو۔ محبت کی افیون دے کر اپنے مقاصد کے لیے سوسائٹی میں برتری کے لیے

استعمال کرنا چاہتی تھیں۔ مگر تم میری نظر میں کیا ہو؟ ـــــ (ہنستا ہے) ـــــ ایک لالچی بھکارن! میرے برش نے تمھارے ساتھ پورا انصاف کیا ہے۔ (ہنس کر) ـــــ اور تم شاہدہ! تمھاری آنکھوں کی خوبصورت جھیلوں میں کبھی میں ڈوب جانا چاہتا تھا۔ ان آنکھوں کی تہہ میں کیا ہے۔ یہ میں آج سمجھا ہوں ـــــ (ہنستا ہے) ـــــ تم بھی ایک فریب تھیں اور آج مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ میرے کاندھوں پر جو بوجھ تھا۔ بھاری بوجھ دنیا داری کا بوجھ ـــــ سماج کے رسم و رواج کا بوجھ۔ آج وہ بوجھ میں نے اُتار کر پھینک دیا ہے۔ میرا دل۔ میرا برش۔ میرا فن آج پھر یہ سب آزاد ہیں اور یہ گھر یہ زرد دیوار یہ پردے۔ یہ صوفے۔ اب یہ سب کس لیے، کیوں؟ یہ سب غلامی کی یاد دلاتے ہیں، میرے فن کو۔ مجھے، ان چیزوں کی کوئی ضرورت نہیں۔ اب مجھے فن کی نئی بلندیوں تک پہنچنا ہے۔ کیوں نہ اس آباد ویرانے کو چھوڑ کر دُور چلا جاؤں۔ آج ـــــ ابھی ـــــ نئی منزل کی تلاش میں۔

(ساجد تصویروں کو ادھر اُدھر پٹکتا ہے۔ برش ایک طرف کو پھینک دیتا ہے اور کمرے پر ایک طائرانہ نظر ڈالتا ہوا کوٹ کاندھے پر لٹکائے باہر جاتا ہے۔ اسٹیج کی روشنیاں گُل ہو جاتی ہیں)

(۲)

(اسٹیج پر روشنی ہوتی ہے تو پس منظر سے شہر کا شور اور بازار کی چہل پہل کی آوازیں آتی ہیں اور اسٹیج کے پیچھے سے مختلف لوگ ادھر سے اُدھر تیزی سے آتے جاتے نظر آتے ہیں ـــــ آس پاس کے ماحول سے بے نیاز ـــــ اپنی ہی دھن میں ـــــ ایک طرف دو ایک بنچیں پڑی ہیں۔ ایک بنچ کے پاس ساجد حیران سا کھڑا ہے اور آتے جاتے لوگوں اور ماحول کو آنکھیں پھاڑے دیکھ رہا ہے)

ساجد :۔ تو یہ ہے بمبئی ـــــ رنگ و نور کا شہر۔ حُسن کی رعنائیوں کا شہر، اونچی بلڈنگوں اور شاندار ہوٹلوں کا شہر ـــــ فن کاروں کی ناقدری کا شہر ـــــ شہرت کے اونچے میناروں کا شہر ـــــ گمنامی کے اندھے غاروں کا شہر ـــــ محبت کا شہر ـــــ نفرت کا شہر ـــــ دولت کا شہر ـــــ اس شہر کی روح کو میں رنگ اور برش میں سمیٹ کر اپنے شاہکاروں میں بند کر لوں گا ـــــ یہ اونچی عمارت ـــــ یہ پام کے

درخت ـــــ یہ چہل پہل ـــــ یہ رنگ برنگی موٹریں ـــــ زندگی میں پھر فرصت ملے نہ ملے۔ ابھی اس بینچ پر بیٹھ کر اس منظر کو کاغذ پر اتارلوں۔

(ساجد بینچ پر بیٹھ کر ماحول کی تصویر بنانے لگتا ہے ـــــ ایک دو آدمی اس کے پاس سے تصویر پر اچٹتی سی نظر ڈال کر گزر جاتے ہیں۔ پھر ایک شوخ دوشیزہ اٹھلاتی ہوئی آتی ہے ـــــ مصوّر اور تصویر کو نظر بھر کر دیکھتی ہے ـــــ اور وہیں رُک جاتی ہے)

ایک عورت :۔ ایک دم ہائی کلاس ـــــ کیا اچھا آرٹسٹ ہوتا ـــــ اے ـــــ اے ـــــ

ساجد :۔ جی ـــــ آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟

عورت :۔ ہاں ـــــ تم بہت اچھا کلاکار معلوم ہوتا۔ بیٹھے بیٹھے سینری بنادیتا۔

ساجد :۔ شکریہ۔

عورت :۔ پردیسی ہوتا ـــــ بمبئی میں ابھی آئے لا؟

ساجد :۔ جی ہاں۔

عورت :۔ کہاں رہتا؟

ساجد :۔ فٹ پاتھ پر۔

عورت :۔ چھی چھی چھی ـــــ اتنا اچھا کلاکار فٹ پاتھ پر سوتا۔

ساجد :۔ پھر میڈم ـــــ بمبئی میں مکان کہاں ملتا بغیر پگڑی کے؟

عورت :۔ ہمارے ساتھ چلیں گا؟

ساجد :۔ آپ کے ساتھ؟ کہاں؟

عورت :۔ ہم کوئی جہنم میں تو لے نہیں جائے گا۔ سیٹھ کو بول کے نوکری دلائیں گا۔ رہنے کو مکان دلائیں گا ـــــ اور کیا مانگتا ـــــ ایک دم فس کلاس بنگلہ۔

ساجد :۔ وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر

عورت :۔ اگر مگر کیا ـــــ خالی پیلی بننا نہیں مانگتا۔ ٹھیک ہے تو چلو ـــــ نہیں چلو تو بیٹھو ـــــ بولو۔

ساجد :۔ اچھا چلتا ہوں ـــــ ذرا ٹھہریے۔

عورت :۔ ہاں ایسا بولو ـــــ (مس کا نچ والا ساجد کے پاس بینچ پر بیٹھ جاتی ہے۔)

عورت :۔ تمھارا نام کیا ہے؟

ساجد :۔ ساجد۔

عورت :۔ اپن کا ملک کون سا ہوتا؟

ساجد :۔ میرٹھ ـــــ دہلی کے پاس۔

عورت :۔ شادی بنایا؟

ساجد :۔ شادی!

عورت :۔ شرماتا (ہنس کر) اچھا ایسا سوال نہیں پوچھیں گا تم سے۔

عورت :۔ پینٹنگ کب سے سیکھا؟

ساجد :۔ بچپن سے۔

عورت :۔ جب ہی اتنا اچھا کلا کار ہوتا۔ پوسٹر بنانے سکتا؟

ساجد :۔ پوسٹر!! میں مصوّر ہوں۔

عورت :۔ (ہنس کر) ایک دم ہائی کلاس آرٹسٹ اور ہائی کلاس دماغ ہوتا ـــــ ہوں!

ساجد :۔ ہوں!

عورت :۔ اچھا ہمارا تصویر بنائیں گا۔

ساجد :۔ ضرور!

عورت :۔ کب؟

ساجد :۔ یہ کہنا مشکل ہے۔

عورت :۔ ایسا کیسا بولتا؟

ساجد :۔ میں پہلے آدمی کو سمجھتا ہوں پھر تصویر بناتا ہوں۔

عورت :۔ تو ایسا بولو ـــــ ہم کوئی پہیلی نہیں۔ تم ہمیں جلدی سمجھ جائے گا۔

ساجد :۔ پھر تصویر بھی بن جائے گی۔

عورت :۔ گڈ ـــــ اچھا اب چلنا مانگتا۔

ساجد :۔ چلیے۔

(۳)

(ایک سیٹھ کا دفتر ـــــ آرام دہ صوفے پڑے ہوئے ہیں ـــــ ایک صوفے پر

سیٹھ جی آلتی پالتی مارے بیٹھے ہیں۔ اِدھر اُدھر ٹیلی فون رکھے ہوئے ہیں ـــــ کمرے میں ایک میز ہے جس پر فائلوں کے انبار ہیں۔ وہیں ایک کرسی پر ساجد مجسّم سوال بنا بیٹھا ہے ـــــ اس کے ہاتھ میں کچھ تصویریں ہیں ـــــ سیٹھ جی ساجد پر ایک بھرپور نظر ڈال کر اس کا جائزہ لیتے ہیں پھر بڑے غرور کے ساتھ اس سے سوال کرتے ہیں)

سیٹھ :۔ اچھا تو آپ چترکار ہیں؟

ساجد :۔ ہاں۔

سیٹھ :۔ دکھائیے کیا بناتے ہیں آپ۔ کچھ لائے ہیں؟

(ساجد دو تین تصویریں سیٹھ جی کو پیش کرتا ہے)

سیٹھ :۔ ہوں ـــــ ہاں ـــــ بھئی کیسی تصویریں ہیں یہ۔ نہ روپ نہ رنگ، عجیب بھونڈے بھونڈے، بھدّے رنگ تھوپ رکھے ہیں۔

ساجد :۔ یہ تصویر دیکھیے۔

سیٹھ :۔ یہ تصویر ـــــ کیا خاص بات ہے اس میں؟

ساجد :۔ غور سے دیکھیے سیٹھ صاحب۔

سیٹھ :۔ غور سے دیکھنے کی تو کوئی بات نہیں اس میں اس عورت کی ناک بہت چپٹی ہے۔ کیوں؟

ساجد :۔ میں نے یہ خیال پیش کرنے کی کوشش کی ہے کہ سماج میں اس کی عزّت نہیں۔

سیٹھ :۔ (ہنس کر) خوب خیال پیش کیا ہے آپ نے اور اس تصویر کے ہاتھ کہاں گئے۔

ساجد :۔ سماج نے کاٹ دیے۔

سیٹھ :۔ اور اس کا لباس کیا ہوا؟

ساجد :۔ سوسائٹی کے ظالم ٹھیکیداروں نے تار تار کر دیا۔

سیٹھ :۔ (قہقہہ لگا کر) واہ۔ خوب بہت خوب آپ نے خیال ہی پیش کیے ہیں۔ تصویریں نہیں بنائیں۔ میرے خیال میں تو آپ کی مت کٹ گئی ہے جو اس قدر بے ہنگم اور بے تکی تصویریں بنانے کی کوشش کی ہے۔ ہٹاؤ یہ کباڑ ـــــ!

سیٹھ :۔ سیٹھ جی یہ کباڑ نہیں تصویریں ہیں۔

سیٹھ :۔ اچھا تصویریں ہی سہی مگر ہمیں ایسی تصویروں کی ضرورت نہیں ہے ۔ دراصل مس کانچ والا نے آپ کی بہت تعریف کی تھی تو میں نے سوچا دو چار تصویریں آپ سے خرید لوں گا۔ میرا کلینڈروں کا کام ہے ۔ مگر آپ کی بنائی ہوئی تصویریں دیکھ کر تو آدمی خواہ مخواہ ہی ڈر جائے ——— کوئی خوبصورت سی تصویر نہیں بنا سکتے آپ ؟

ساجد :۔ دنیا میں خوبصورتی ہے کہاں سیٹھ صاحب ۔

سیٹھ :۔ واہ ۔ واہ ایک سے ایک حسین موجود ہے دنیا میں اور اس شہر بمبئی میں کس چیز کی کمی ہے ۔ آپ کہیے تو میں آپ کے لیے ماڈل منگوا دوں ۔

ساجد :۔ میں چہرے کی تصویریں نہیں بناتا ۔ رُوح کی تصویر کشی کرتا ہوں ۔

سیٹھ :۔ تو پھر اُسے مردے ہی پسند کر سکتے ہیں ۔

ساجد :۔ خیر میں آپ سے کوئی نئی بحث نہیں کرنا چاہتا ——— شکریہ !

سیٹھ :۔ ٹھہریے ——— کیا نام ہے آپ کا ؟

ساجد :۔ ساجد ۔

سیٹھ :۔ ساجد صاحب، آپ کو مس کانچ والا نے میرے پاس بھیجا ہے، اس لیے ان کی خاطر آپ کی کوئی نہ کوئی خدمت کرنا چاہتا ہوں ۔ آپ کچھ پڑھے لکھے ہیں ۔

ساجد :۔ جی ہاں ۔ بی اے پاس ہوں ۔

سیٹھ :۔ تو پھر چھوڑیے چترکاری کا چکّر ——— میری فرم میں ایک جگہ خالی ہے ۔ زیادہ مشکل کام بھی نہیں ۔ بس روزانہ دس بیس چٹھیوں کے جواب لکھنے ہوں گے ۔ فی الحال میں آپ کو ایک ہزار روپے ماہوار تنخواہ دوں گا بعد میں اور دیکھا جائے گا ۔

ساجد :۔ شکریہ سیٹھ صاحب ۔ میں کلاکار ہوں ۔

سیٹھ :۔ کلاکار ! تو پھر کلا کی سیوا کیے جاؤ ۔

ساجد :۔ آداب عرض (ساجد اپنی تصویریں سمیٹ کر مرے مرے قدموں سے باہر چلا جاتا ہے)

(۴)

(اسٹیج پر روشنی ہوتی ہے تو ساجد ایک خالی خالی کمرے میں ایک اسٹول پر بیٹھا خالی خالی نظروں سے درو دیوار کو گھور رہا ہے ۔ مس کانچ والا اٹھلاتی ہوئی اور مسکراہٹیں بکھیرتی

ہوئی کمرہ میں داخل ہوتی ہے)

مس کاپنج والا: ـ کلا کار نوکری نہیں مانگتا۔ ایک دم ہائی کلاس بات۔ اپن بہت خوش ہلوا۔ کلا کار ساجد۔

ساجد:۔ فرمائیے مس کاپنج والا۔

عورت:۔ بمبئی شہر تمھیں کیسے لگا؟

ساجد :۔ بہت عجیب ــــ ایسا شہر جہاں ہر وقت سورج بھی چمکتا ہے اور ہر وقت رات بھی چھائی رہتی ہے۔

عورت :۔ ویری گڈ آئیڈیا ــــ بمبئی کی کوئی تصویر بنا نے سکتا۔

ساجد :۔ ہاں کیوں نہیں؟

عورت:۔ ہم اس کو بکوائیں گا۔

ساجد:۔ مگر میں یوں اپنی تصویر نہیں بیچنا چاہتا۔ مجھے کہیں ایک کھولی مل جائے تو میں بہت سی تصویریں بنانا چاہتا ہوں۔ اُن کی نمائش کرنا چاہتا ہوں۔

عورت :۔ ایکزی بیشن ــــ ایک دم ہائی کلاس بات۔ پھر تمھارا نام اخباروں میں آئیں گا۔ تمھارا فوٹو چھپیں گا۔ تم انٹرویو میں کہیں گا ہمیں مس کاپنج والا نے کلا کار بنایا۔'

ساجد:۔ ہم ابھی کچھ کہہ نہیں سکتا۔

عورت :۔ تم بہت ناٹی معلوم ہوتا۔ کھولی کیوں کرائے پر لینا مانگتا؟ اب ہم تمھیں اس بنگلے سے نہیں جانے دیں گا۔ یہ کوارٹر ہمارے کوک کا ہوتا۔ ہم اسے سرونٹ کے ساتھ رہنے کو کہیں گا۔ تم اکھّا دن یہیں رہنا مانگتا۔

ساجد:۔ نہیں نہیں مس کاپنج والا۔ یہاں زیادہ دن رہ کر میرا دم گھُٹ جائے گا۔

عورت :۔ ایسا کیسا بولتا ــــ سمندر کے کنارے خوب ہلوا آتا۔

ساجد:۔ یہ ہلوا زہریلی ہے۔

عورت:۔ ناٹی ــــ ہم نے چوپڑیوں میں پڑھا تھا کہ کلا کار لوگ بہت عجیب ہلوتا۔ ونڈرفل۔ تم سچ مچ ونڈرفل کلا کار ہے۔ ہماری ایک بات مانیں گا۔

ساجد :۔ کہیے؟

عورت :۔ ہمیں بھی پینٹنگ سکھانا مانگتا۔ ہم بھی کلا کار بن جائیں گا۔ پھر ہم دونوں کی پینٹنگس

کا ایک ایکزی بیشن۔

ساجد:۔ جی ـــــ مِس کاپنج والا۔ یہ کیا بول رہی ہیں آپ؟ کلا کسی کے سکھانے سے نہیں آتی۔ یہ تو آدمی کی روح میں ہوتی ہے۔ آتما کی آواز ہوتی ہے۔ کلاکار کا کام صرف اتنا ہوتا ہے کہ اس آواز کو لکیروں اور رنگوں میں پلیش کر دے اگر آپ کلاکار نہیں ہیں تو میں آپ کو کلاکار کیسے بنا سکتا ہوں؟

عورت:۔ تم نہیں سمجھے۔ میری آتما سے یہی ایک آواز آتا۔ تم بہت ناٹی ـــــ اس آواز کو سننا نہیں مانگتا؟ ـــــ کلاکار ـــــ تم میری روح کو میری آنکھوں میں دیکھنے نہیں سکتا۔

ساجد:۔ نہیں ـــــ مجھے کچھ نظر نہیں آتا۔

عورت:۔ (پیار سے) خالی پیلی سُننا نہیں مانگتا۔

ساجد:۔ نہیں مِس کاپنج والا نہیں ـــــ میں نادان بچّہ نہیں ہوں۔ میں زندگی کے گرم و سرد کا شکار ہوں۔ آپ مجھے جو راستہ دکھا رہی ہیں وہ فن کی موت کا راستہ ہے۔ وہ خودکشی کا راستہ ہے۔

عورت:۔ (غصّہ سے) تم ایسا کیسا بولتا۔ تم ہمارا انسلٹ کرنا مانگتا۔ ہم تمھیں فٹ پاتھ سے اٹھا کر بنگلہ میں لایا۔ تمھارا عزّت کیا۔ اور تم ـــــ

ساجد:۔ شکریہ مِس کاپنج والا۔ میں آپ کے بنگلہ میں رہ کر آپ کے ہاتھوں کھلونا نہیں بننا چاہتا آپ کی عنایتوں کے پیچھے جو آپ کے خطرناک ارادے ہیں میں انھیں سمجھ سکتا ہوں۔

عورت:۔ تم ہماری انسلٹ کرنے سے باز نہیں آئیں گا تو بہت پچھتائیں گا۔ ہمارا نام مِس کاپنج والا ہے۔ یاد رکھو ہم تمھیں بمبئی میں رہنا مشکل کر دے گا۔

ساجد:۔ میں خود اس شہر میں رہنا نہیں چاہتا۔ یہاں کوئی کسی کا نہیں۔ انسان کو تو کیا اس شہر کی ایک اینٹ دوسری اینٹ کو نہیں پہچانتی۔ بغیر مطلب کوئی کسی کو بھیک کا ٹکڑا بھی نہیں دیتا۔ مطلب یہ کہ یہ دنیا میرے فن کے لیے موت کی دنیا ہے۔ میں خود اپنی نظروں میں گرتا جا رہا ہوں اور محسوس کر رہا ہوں کہ یہاں ایک کلاکار اپنی نظروں میں گرنے کے بعد ہی دنیا کی نظروں میں چڑھ سکتا ہے۔ مگر میں ایسی شہرت کے لیے اپنے ضمیر کی قربانی نہیں دے سکتا۔

عورت :۔ ہم تمہاری اسپیچ سننا نہیں مانگتا۔ تم ہوش میں نہیں آئیں گا تو ہم ابھی۔ ۔ ۔ ۔

ساجد :۔ آپ کو کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں ـــــ میں آج ـــــ ابھی یہاں سے جا رہا ہوں
اس شہر سے جا رہا ہوں۔ اپنے شہر۔ اپنے گھر ـــــ

عورت :۔ ملک جانا مانگتا ـــــ بزدل ـــــ کاورڈ۔

ساجد :۔ گڈ بائی مس کانچ والا۔

(ساجد بڑی تیزی سے باہر نکل جاتا ہے۔ مس کانچ والا دانت پیستی رہ جاتی ہے۔ اسٹیج پر اندھیرا چھا جاتا ہے)

(۵)

(ایک کچا آنگن ـــــ ادھر اُدھر بے ترتیبی سے بکھرا ہوا سامان ـــــ باورچی خانے میں پڑے ہوئے برتن گھر کی ویرانی کی داستان سُنا رہے ہیں۔ ساجد ایک دروازے سے داخل ہوتا ہے۔ گھر کی ایک ایک چیز دیکھتا ہے۔ اس کے چہرے پر خوشی اور محرومی کے ملے جُلے جذبات اُبھرتے ہیں)

ساجد :۔ وہی گھر ـــــ وہی در و دیوار ـــــ وہی آنگن ـــــ وہی سوندھی سوندھی مہک
اُف ـــــ کتنا ترس گیا تھا اس ماحول کو! چند مہینوں میں ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے میں نے برسوں بعد اس گھر میں قدم رکھا ہے۔ بچپن کی یادیں، لڑکپن کی باتیں سب اس گھر میں محفوظ ہیں۔ ہاں میں نے پہلے پہل اس بیری کے درخت کی تصویر بنائی تھی ـــــ لیکن یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی یہ گھر اجنبی کیوں لگ رہا ہے۔ ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے یہ در و دیوار مجھ سے کچھ پوچھ رہے ہیں۔ روشن دانوں کی آنکھیں کسی کے انتظار میں جاگ رہی ہیں ـــــ یہ خالی برتن ـــــ یہ ٹھنڈا چولھا ـــــ یہ بے ترتیب سامان عجیب طرح بکھرا پڑا ہے۔ شاید اس گھر کو مجھ سے زیادہ کسی اور کی ضرورت ہے شاید انھیں یاد آرہی ہے شاہدہ کی ـــــ شاہدہ اس گھر کی رانی ہی تو ہے ـــــ شاہدہ ـــــ شاہدہ ـــــ شاہدہ ـــــ کیا میں اس کے بغیر زندہ رہ سکوں گا نہیں نہیں ـــــ اُف، یہ کیا ہے؟ کبھی اس کا وجود ناگوارا تھا۔ آج اس کی جدائی کا احساس شدید ہوتا جا رہا ہے ـــــ شدید۔ وہ میرے فن کی موت نہیں زندگی ہے۔

یہ اُس کی جدائی کا احساس ہی تو ہے جس نے گھر کے دیوار و در کو سوگوار کر دیا ہے جدائی کے اس لمحہ کو اس احساس کو کاغذ پر اُتار دوں ـــــ ہوں ـــــ ہاں ـــــ

(کینوس اور برش اندر سے اٹھا لیتا ہے اور بے اختیاری میں تصویر بنانے لگتا ہے)

شاہدہ ـــــ ”تم اس گھر کو چھوڑ گئی ہو / مجھ سے بھی منہ موڑ گئی ہو / لیکن تم سے یہ کہنا تھا / لوٹ کے میں جب گھر آیا ہوں / ٹوٹے پھوٹے کچے برتن / ـــــ خالی گھڑا یا ٹھنڈا چولھا / پھٹے پرانے میلے کپڑے / ـــــ طاق میں آئینہ کا ٹکڑا / مجھ کو یوں تکتے ہیں جیسے / پوچھ رہے ہوں، کب تک آخر / ہم یوں ہی بے کار رہیں گے / کب آئے گی گھر کی رانی؟“

یہ سادہ مگر سچی تصویر مکمّل ہے۔ اس میں شاہدہ کی جدائی کا درد سمٹ آیا ہے۔ یہ تصویر سچ مچ میرا شاہکار ہے۔ میں شاید اس شاہکار کی تلاش میں شہر شہر بھٹکا۔ بمبئی کی خاک چھانی۔ مگر میرا شاہکار یہاں میرا منتظر تھا۔ اب میں اس تصویر کو عالمی مقابلے میں بھیجوں گا۔ ہاں۔ ہاں۔

(ساجد اپنی بنائی ہوئی سادہ تصویر کو فخر و اعتماد سے دیکھتا ہے۔ اسٹیج کی روشنی آہستہ آہستہ گُل ہو جاتی ہے)

(۶)

(ایک سلیقہ سے سجایا ہوا ڈرائنگ روم۔ ہر چیز قرینے سے رکھی ہے۔ مگر خاموشی طاری ہے ـــــ ایک کرسی پر شاہدہ سر جھکائے بیٹھی ہے ـــــ اُداسی کی تصویر بنی ہوئی ـــــ ایک دروازے سے راشدہ دبے پاؤں داخل ہوتی ہے ـــــ اور چند سیکنڈ دُور اور خاموش کھڑی رہ کر شاہدہ کو خالی خالی نظروں سے دیکھتی رہتی ہے پھر اس کے قریب جا کر اس سے مخاطب ہوتی ہے)

راشدہ:۔ شاہدہ! یہ کیا ہے آخر؟ تم ہر وقت منہ لٹکائے بیٹھی رہتی ہو۔ نہ چوڑیاں پہنتی ہو ـــــ نہ ٹھکانے کے کپڑے۔

شاہدہ:۔ باجی! آخر یہ سب اب کس کے لیے کروں؟ اور یہ سب آپ کی عنایت ہے۔ نہ آپ مجھے زبردستی اس دن میرے گھر سے لاتیں نہ میں اس حال کو پہنچتی۔

راشدہ:۔ ہاں میں نے تم سے دشمنی نکالی تھی نا؟ زندگی میں گرم و سرد چلتا ہی رہتا ہے۔ اگر ساجد

کو تم سے محبت ہوتی تو وہ دس دفعہ ناک رگڑنے آتا۔

شاہدہ :۔ میں جانتی ہوں وہ بڑے خود دار ہیں اور خود یہاں کبھی نہیں آئیں گے۔

ساجد :۔ (خاموشی سے کمرے میں داخل ہوتا ہے) نہیں شاہدہ ـــــ وہ خود داری نہیں، خود پرستی تھی۔ (قدموں کی آواز پر راشدہ چونکتی ہے)

راشدہ :۔ کون ـــــ ساجد!

ساجد :۔ ہاں باجی آداب!

راشدہ :۔ جیتے رہو۔

ساجد :۔ میں اپنی غلطی کا اعتراف کرنے اور شاہدہ سے معافی مانگنے آیا ہوں۔

شاہدہ :۔ نہیں نہیں ایسا نہ کہیے۔

راشدہ :۔ ارے بھیّا مجھے تو اس کی خوشی ہے کہ تم آگئے ـــــ اچھا میں تمھارے لیے ناشتہ کا بندوبست کرتی ہوں۔

(راشدہ کمرے میں باہر چلی جاتی ہے)

ساجد :۔ شاہدہ ـــــ تم مجھ سے جتنی خفا ہو کم ہے۔

شاہدہ :۔ میں خفا ہونے والی کون ہوتی ہوں۔ کنیز کی بساط ہی کیا ہے۔

ساجد :۔ کنیز نہیں دل کی ملکہ ـــــ گھر کی رانی۔

شاہدہ :۔ ہاں رانی جسے راجا نے دھکّے دے کر گھر سے نکال دیا۔

ساجد :۔ نہیں، شاہدہ نہیں۔ میں تم سے اپنی حماقتوں کی معافی مانگنے آیا ہوں۔ میں نے تمھاری غیر موجودگی میں ہی تمھاری اہمیت کو سمجھا۔

راشدہ :۔ (تیزی سے کمرے میں آتی ہے۔ تازہ اخبار اس کے ہاتھ میں ہے)

مبارک ہو ساجد! بہت بہت مبارک!

ساجد :۔ کیا باجی کیا؟

راشدہ :۔ (کھِلتے ہوئے لہجے میں) یہ اخبار پڑھو میں ابھی آئی۔ تم دونوں کا منہ میٹھا کرانا ہے۔

(راشدہ اخبار ساجد کو دے کر باہر چلی جاتی ہے۔ ساجد اخبار کے صفحے اُلٹتا ہے۔ پھر ایک دم اُس کی نظریں ایک خبر پر جم جاتی ہیں۔ چہرہ کا رنگ کھِل اُٹھتا ہے اور وہ تیزی اور مسرّت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ خبر پڑھتا ہے)

ساجد :۔ "پینٹنگ کے عالمی مقابلے میں بھارت کے ایک غیر معروف آرٹسٹ ساجد کی بنائی ہوئی تصویر "گھر کی رانی"، اول نمبر پر ـــــ اس تصویر میں زندگی کی حقیقت کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔ یہ تصویر کسی ایک ملک کی ـــــ یا کسی ایک طبقہ یا کسی ایک فرقے کی نہیں۔ بلکہ تمام انسانوں کے دلوں کی ترجمانی کرتی ہے"۔

(ساجد فرطِ مسرّت سے بے قابو ہو جاتا ہے۔ پھر شاہدہ کو جھنجھوڑتا ہے)

شاہدہ! شاہدہ تم نے پڑھا یہ اخبار۔ دیکھو۔ میری تازہ تصویر "گھر کی رانی"، کو عالمی مقابلے میں پہلا انعام ملا ہے اور میں گمنامی کے غار سے نکل کر شہرت کے آسمان پر پہنچ گیا ہوں۔

شاہدہ :۔ مبارک ہو۔ کون ہے وہ گھر کی رانی؟

ساجد :۔ تم ـــــ شاہدہ تم ـــــ تمہارے بغیر گھر میں جدائی اور درد کے سائے لہرانے لگے تھے اور میں نے اس احساس کو کاغذ پر منتقل کر دیا۔

شاہدہ :۔ تو میرے وجود سے زیادہ میری غیر موجودگی تمہارے کام آئی۔

ساجد :۔ نہیں شاہدہ نہیں۔ یوں پے در پے طنز نہ کرو۔ وہ میری غلطی تھی۔ بھول تھی لیکن اس ٹھوکر نے مجھے اچھا سبق دیا۔ میں جھوٹی خودداری کا لبادہ اوڑھے کہاں کہاں نہیں بھٹکا ـــــ لیکن پناہ ملی تو پھر گھر میں آکر ـــــ اور اب اس گھر کا ذرّہ ذرّہ مجھ سے سوال کرتا ہے "کب آئے گی گھر کی رانی؟ کب آئے گی گھر کی رانی!"،

شاہدہ :۔ (رو کر) کہہ دینا مر چکی وہ کنیز جو گھر کے ذرّہ ذرّہ کو جھاڑ پونچھ کر چمکایا کرتی تھی۔

ساجد :۔ نہیں شاہدہ نہیں۔ اتنی سخت سزا نہ دو مجھے۔ اتنا بھیانک انتقام نہ لو مجھ سے۔

راشدہ :۔ (ہنستی ہوئی آتی ہے) ساجد! لو مٹھائی کھاؤ پہلے ـــــ شاہدہ تم بھی منہ کھولو ـــــ

ساجد :۔ بہت بہت شکریہ باجی ـــــ مگر سنیے باجی میں شاہدہ کو لینے آیا ہوں مگر یہ ـــــ

راشدہ :۔ تم اس کی باتوں پر نہ جاؤ۔ اسے میں تمہارے گھر سے لائی تھی اور میں ہی واپس پہنچانے کا ذمّہ لیتی ہوں۔ لو تم بے فکری سے چائے پیو۔

ساجد :۔ میری اچھی باجی!

(ساجد راشدہ کے سامنے احتراماً سر جھکاتا ہے۔ وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتی ہے۔ شاہدہ کے چہرے پر بھی تبسّم کھیلنے لگتا ہے ـــــ پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے)

بگولے

(ریڈیائی ڈرامہ)

کردار:

- شفیقہ : ایک شادی شدہ مگر فلرٹ عورت۔ عمر تقریباً تیس سال۔
- زبیدہ: شفیقہ کی سہیلی مگر سنجیدہ مزاج عمر تقریباً بائیس سال۔
- زلیخا : ایک اور فلرٹ۔ عمر تقریباً ۲۵ سال۔
- عارف: ایک خوبرو نوجوان جو بیک وقت شفیقہ اور زلیخا سے فلرٹ کرتا ہے۔
- حشمت: ایک شاعر۔

(مقام اور زمانہ: بمبئی ۱۹۵۰ء)

"اس نے میرے خلوص کو ٹھکرا دیا۔ میں نے پھولوں کے بدلے خار چننے
اب میری محبت محدود نہیں۔ میں ہر خار کو پھول سمجھ کر چن لیتی ہوں۔ اور دانستہ
فریب کھاتی ہوں۔ مجھے اپنی روح کو اذیت دینے میں مزہ آنے لگا ہے۔ محبت!
(ہنستی ہے) اگر میری وارفتہ مزاجی سے پوچھو تو میں ہر شخص سے محبت کرتی
ہوں۔ مجھے کسی کے بال اچھے لگتے ہیں، کسی کی رومانی آنکھیں، کسی کا قد، تو
کسی کی لچھے دار باتیں، کسی کی خوشامدیں، کسی کی سپردگی، کسی کی بیزاری میں،
ہر چیز میں لذت محسوس کرتی ہوں اور اپنی تفریح کا سامان ڈھونڈ لیتی ہوں۔
مگر میری سنجیدگی سے پوچھو تو مجھے ان سب چیزوں سے نفرت ہے"
(اس ڈرامے کا ایک اقتباس)

بگولے

(مغربی طرز کا آرکیسٹرا فیڈ ان ہوتا ہے اور اس کے پس منظر میں چلے جانے کے بعد مہذب قہقہے اور بے لفظ آوازیں ایک بڑے ہال میں بہت سے لوگوں کی موجودگی کا یہ منظر پیش کرتی ہیں کہ فائیو اسٹار ہوٹل کا یہ ڈرائنگ ہال سمندر کے کنارے ہے۔ کبھی کبھی دور سے سمندر کی لہروں کی آواز بھی آجاتی ہے۔ کبھی کبھی طبلہ ٹھیک کرنے کی آواز بھی دور سے آتی ہے جو اس بات کی مظہر ہے کہ ہال کے اسٹیج پر موسیقی کا پروگرام پیش کیا جانے والا ہے۔ پورے ڈرامہ میں آرکیسٹرا اور لوگوں کے بولنے چالنے کی آوازیں اور قہقہے موقع محل کی مناسبت سے ڈوبتے ابھرتے رہتے ہیں۔)

شفیقہ:۔ افوہ زبیدہ! ایسی بھی کیا سنجیدگی۔ تم اس لباس میں اٹھارہویں صدی کی حسینہ لگ رہی ہو۔

زبیدہ:۔ اچھا ہی تو ہے۔ لوگ ماضی کی گئی گزری چیز سمجھ کر نظر انداز کردیں گے، اور پھر سب کی نظریں ٹھہریں گی ہماری حسینۂ عالم شفیقہ پر۔

شفیقہ:۔ چلو اب ایسا بھی نہیں۔ مجھے بناؤ مت۔ یہاں سب موڈرن عورتیں ہیں۔ زیوروں سے لدی پھندی ایسے ماحول میں تم الگ نظر آرہی ہو۔ ہوسکتا ہے آج تم پر ہی نظریں ٹھہریں اس پارٹی میں۔

زبیدہ:۔ اچھا اب تم میری کھینچائی پر اتر آئیں۔

(دونوں ہنستی ہیں۔ ہال کا شور ابھر کر پھر پس منظر میں چلا جاتا ہے)

شفیقہ :۔ اُف! کب شروع ہوگا یہ پروگرام۔

زبیدہ :۔ ابھی تو سوا پانچ ہی بجے ہیں۔

شفیقہ :۔ سوا پانچ؟ ابھی پندرہ منٹ اور باقی ہیں۔ مجھ سے اب انتظار نہیں ہوسکتا۔ چلو زبیدہ۔

زبیدہ :۔ بھئی ایسی بھی کیا بے چینی۔ ٹھہرو اور لوگ بھی تو بیٹھے ہیں۔

شفیقہ :۔ جانے اور لوگ کیسے انتظار کرسکتے ہیں۔ پتہ نہیں دُنیا اتنی ساکت کیوں ہے؟ ہر طرف جمود۔

زبیدہ :۔ یہ جمود نہیں ہے۔ کچھ اصول بھی ہوتے ہیں جن کی پابندی کرنا پڑتی ہے۔

شفیقہ :۔ یہ سب تمدّن کے ڈھکوسلے ہیں۔ مجھے تو ہنسی آتی ہے کہ آدمی اس زمانہ میں بھی قدم قدم پر پابندیاں برداشت کرتا ہے۔

زبیدہ :۔ تمھیں تو شاید اس بات پر ہنسی آئے گی کہ سورج روز مشرق سے ہی کیوں نکلتا ہے۔

شفیقہ :۔ ہاں واقعی کیا مضحکہ خیز بات ہے۔ جانے کب قیامت آئے گی اور سورج مغرب سے نکلے گا۔

زبیدہ :۔ اطمینان رکھو۔ تمھاری زندگی میں قیامت نہیں آئے گی۔ (ایک مردانہ قہقہہ کی آواز)

شفیقہ :۔ (قہقہہ لگاکر) ارے وہ عارف ہے کیا؟

زبیدہ :۔ کون عارف؟

شفیقہ :۔ بھئی عارف۔ تم نہیں جانتیں اسے؟

زبیدہ :۔ نہیں تو ....

شفیقہ :۔ تعجب ہے۔ تم لڑکی ہوکر اسے نہیں جانتیں۔

زبیدہ :۔ کوئی ضروری ہے اس کا جاننا؟

شفیقہ :۔ ہاں عارف ہی تو ہے۔

زبیدہ :۔ تم اس آدمی کے بارے میں کہہ رہی ہو جو زلیخا کے پاس بیٹھا ہے؟

شفیقہ :۔ ہاں۔ ابھی آیا ہے شاید۔

زبیدہ :۔ نہیں تو۔ وہ بہت دیر سے زلیخا سے باتیں کررہا ہے۔

شفیقہ :- تو پھر اس نے مجھے نہیں دیکھا ہوگا۔

زبیدہ :- یہ تم جانو اور وہ جانے۔

شفیقہ :- دیکھو اس نے ابھی میری طرف دیکھا تھا۔ کتنا وقار ہے اس کے چہرے پر۔ سوٹ کتنا اچھا پہنا ہے۔ دیکھو اس نے میری طرف پھر دیکھا۔ شاید وہ میری طرف آ رہا ہے۔ او۔ اس کمبخت زلیخا نے پھر بٹھا لیا۔ چلو زبیدہ میرا جی گھبرا رہا ہے۔ یہ پروگرام نہ جانے کب شروع ہوگا (زلیخا کا قہقہہ)

زبیدہ :- بیٹھو، دیر ہی کتنی ہے۔

شفیقہ :- کم بخت زلیخا۔ زبیدہ دیکھو وہ پھر اٹھا۔ (عارف کا قہقہہ دور سے) (زلیخا کا قہقہہ)

عارف :- ہلو شفیقہ۔

شفیقہ :- ہلو عارف۔ بیٹھو۔

عارف :- مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم بھی آئی ہو پارٹی میں۔ ابھی زلیخا نے بتایا مجھے۔

شفیقہ :- اب زیادہ مت بنو۔ تمھیں بالکل معلوم تھا کہ میں آج پارٹی میں آ رہی ہوں۔ میں نے تمھارے دفتر فون کیا تو معلوم ہوا کہ تم نیچے گئے ہو۔ پھر گھر فون کیا۔ وہاں بھی نہیں تھے۔ میں نے میسج چھوڑ دیا کہ تم میرے ساتھ ہی پارٹی میں چلنا۔ میں بہت دیر تک تمھارا انتظار کرتی رہی۔

عارف :- مجھے بڑا افسوس ہے۔ مجھے تمھارا میسج نہیں ملا۔ میں دوپہر سے زلیخا کے ساتھ ہوں۔

شفیقہ :- اچھا .....

عارف :- کہیے گھر خیریت ہے۔

شفیقہ :- جی ہاں۔

عارف :- ساجد کا کوئی خط آیا؟

شفیقہ :- ہاں۔ ان کے خط کا کیا ہے روز آتا رہتا ہے، بلکہ جب جی چاہتا ہے ٹرنک کال کر لیتے ہیں۔

عارف :- کب آ رہے ہیں لندن سے۔

شفیقہ :۔ معلوم نہیں

عارف :۔ تمھاری ساس بیمار تھیں اب کیسی ہیں ؟

شفیقہ :۔ چھوڑو نا کیا فضول سی باتیں کر رہے ہو۔ عارف نیلم ٹاکیز میں بڑی اچھی پکچر لگی ہے۔ کل سیکنڈ شو دیکھیں گے۔

عارف :۔ کل! اوہوں۔

شفیقہ :۔ کیوں؟

عارف :۔ کل تو مجھے نکہت کی سالگرہ پارٹی میں جانا ہے۔

شفیقہ :۔ چھوڑو بھی۔

عارف :۔ نہیں میں وعدہ کر چکا ہوں۔

شفیقہ :۔ تم تو وعدہ کر کے بھول جانے کے عادی ہو۔

عارف :۔ مگر بہت خاص موقعوں پر۔

زبیدہ :۔ معاف کیجیے۔ آپ کو زلیخا بلا رہی ہیں۔

عارف :۔ اوہ۔

شفیقہ :۔ میں تعارف کرانا تو بھول ہی گئی۔ یہ میری دوست ہیں زبیدہ اور یہ مسٹر عارف۔

عارف :۔ بڑی مسرّت ہوئی آپ سے مل کر۔

زبیدہ :۔ مجھے بھی۔

عارف :۔ آپ بمبئی میں رہتی ہیں؟

زبیدہ :۔ جی ہاں۔

عارف :۔ اس سے پہلے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔

زبیدہ :۔ اگر ملاقات ہوئی ہوتی تو آج شفیقہ کو تعارف کرانے کی کیا ضرورت پیش آتی۔

عارف :۔ آپ کافی خوش مذاق معلوم ہوتی ہیں۔

زبیدہ :۔ آپ کا حُسنِ ظن ہے۔

عارف :۔ بمبئی میں آپ کے والدین رہتے ہیں یا . . . .

زبیدہ :۔ میں سمجھتی ہوں یہ نہایت غیر ضروری سوال ہے۔

عارف :۔ اوہ معاف کیجیے۔

شفیقہ :۔ چھوڑو عارف۔ یہ بہت بدمزاج لڑکی ہے۔

عارف :۔ مگر بہت دلچسپ۔

حشمت :۔ (فیڈ ان) شفیقہ! میں آداب پیش کرتا ہوں۔

شفیقہ :۔ آپ اور یہاں۔ کہیے۔

حشمت :۔ کہنا کچھ نہیں۔ میں بھی اس پارٹی میں آیا تھا۔ شاید تمھیں میرا یہاں آنا اچھا نہیں لگا۔ معاف کیجیے میں آپ لوگوں کی گفتگو میں مخل ہوا۔ بہر حال میں ادھر بیٹھا ہوں سمندر کی طرف کھڑکی کے پاس (جانے کی آواز)

عارف :۔ کون ہے یہ؟ عجیب بے ہودہ آدمی ہے۔

شفیقہ :۔ ہاں .... کچھ .....

عارف :۔ ہے کون یہ؟ تمھارا کوئی بہت گہرا دوست ہے؟

شفیقہ :۔ میرا دوست! نہیں تو۔ میرا مطلب ہے جان پہچان ہے اس سے میری۔ اور کوئی خاص بات نہیں۔

عارف :۔ بڑا بدتمیز ہے۔ آدابِ محفل سے قطعاً ناآشنا تم ایسے لوگوں کو منہ کیوں لگاتی ہو۔ دیکھا نہیں تمھیں کس جسارت سے آداب کیا اور منہ پھیر کر چلا گیا۔

شفیقہ :۔ میں کہاں منہ لگاتی ہوں۔ تم خواہ مخواہ ....

زلیخا :۔ (جھنجھلاتی ہوئی آواز) عارف تم تو یہیں جم گئے۔ میں اپنی میز پر تمھارا انتظار کر رہی ہوں۔

عارف :۔ بس ایک منٹ کے لیے شفیقہ سے ہلو ہلو کرنے آیا تھا۔

زلیخا :۔ ہلو شفیقہ۔

شفیقہ :۔ ہلو۔

زلیخا :۔ اٹھو بھی اب۔ وہاں کچھ لوگ انتظار کر رہے ہیں۔

عارف :۔ اچھا بھئی معاف کرنا شفیقہ۔ زبیدہ صاحبہ آپ سے مل کر بڑی مسرت ہوئی۔ آپ سے باتیں کرنے کو جی چاہ رہا ہے۔ آئیے آپ بھی ہمارے ساتھ بیٹھیے اس طرف۔

زبیدہ :۔ نہیں شکریہ۔

زلیخا :۔ اب چلو بھی (زلیخا اور عارف کے دوسری طرف جانے کی آواز)

شفیقہ :۔ میرا جی الجھ رہا ہے۔

زبیدہ :۔ کیوں؟

شفیقہ :۔ بھلا کس کم بخت نے حشمت سے کہا تھا کہ اس پارٹی میں آئے اگر آنا تھا تو وہیں الگ کونے میں بیٹھا رہتا۔ مجھے بے پرواہی سے آداب کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ جیسے میں اس کے آداب عرض کی بھوکی تھی اس بھری پارٹی میں۔

زبیدہ :۔ تو کیا ہوا۔ بچارے نے تمھیں آداب کیا اور چلا گیا۔

شفیقہ :۔ مگر اس کی وجہ سے عارف کا موڈ خراب ہو گیا۔

زبیدہ :۔ عارف کا موڈ بھی کوئی موڈ ہے خواہ مخواہ بنتا ہے اور یہ حشمت کون ہے؟

شفیقہ :۔ ہے ایک سرپھرا۔

زبیدہ :۔ میں نے تمھیں اس کے ساتھ ایک پارٹی میں دیکھا تھا۔

شفیقہ :۔ ہاں شامتِ اعمال کے ہاتھوں اس کے ساتھ چلی گئی تھی ایک پارٹی میں۔

زبیدہ :۔ شامتِ اعمال؟

شفیقہ :۔ اور کیا کہوں۔ میرا تو جی جل رہا ہے۔ جس کسی نے بھی وہاں مجھے اس کے ساتھ دیکھا دیکھتا ہی رہ گیا اور مجھے کتنے لوگوں کے طنز یہ فقرے سننے پڑے۔ خواہ مخواہ مذاق کا موضوع بن گئی تھی اس روز۔ تب سے میں نے تہیہ کیا ہے کہ میں اس کے ساتھ کسی جلسہ، کسی کلب اور کسی پارٹی میں نہیں جاؤں گی۔

زبیدہ :۔ مگر تم اسے جانتی کیسے ہو۔؟

شفیقہ :۔ ایسے ہی اس پگلی محمودہ نے ایک دن تعارف کرا دیا تھا۔ اس کے بعد اتفاق سے ایک دو جگہ سرسری ملاقات ہو گئی۔ میں نے ذرا مسکرا کر باتیں کر لیں۔ اب آپ قریب آتے چلے جا رہے ہیں۔

زبیدہ :۔ کیوں۔ کیا تم سے محبت کرنے لگا ہے؟

شفیقہ :۔ اے ہٹو۔ یہ کیا محبت کرے گا دیکھا نہیں کیسی اُجڑی ہوئی شکل ہے۔ اور اس پر ہزار نخرے۔

زبیدہ : اور تم اس کے ناز اٹھاتی ہو۔

شفیقہ :۔ تفو بحالؔ۔ ویسے باتیں اچھی کرتا ہے۔ شاعری کا خبط ہے جناب کو۔ مگر شعر ایسے

کہتا ہے جیسی صورت ہے۔ عجیب بے ڈھنگی سی نظمیں کہتا ہے۔ میں بھی داد دے کر میاں جی کا دل خوش کر دیتی ہوں۔ خیر سے ٹیلی فون بھی کرتے ہیں مجھے بلاناغہ۔

زبیدہ :۔ یوں کہو تم سے کافی ملاقات ہے اور خاصی بے تکلفی ہے۔

شفیقہ :۔ ہاں۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں اس سے پارٹیوں میں بھی اسی طرح ملوں۔ تم خود ہی سوچو وہ ہمارے معیار کا آدمی ہے۔ لوگ میرے متعلق کیا خیال کریں گے۔ کہ شفیقہ اس اجنبی سے کیوں گھل مل کر باتیں کر رہی ہے۔

زبیدہ :۔ تم اوروں سے بھی تو باتیں کرتی ہو۔

شفیقہ :۔ وہ اور بات ہے، ہم سب لوگ پارٹیوں میں ملتے جلتے رہتے ہیں، ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ کوئی انگلی تو نہیں اٹھا سکتا۔ مگر حشمت سے اس طرح بھری محفل میں مل کر میں سوسائٹی کو انگشت نمائی کا موقع کیوں دوں۔

زبیدہ :۔ مگر تمھارا یہ رویہ بُرا نہیں لگے گا اسے۔

شفیقہ :۔ ہونہہ۔ اس کے لیے میں اپنی ایک شام کیوں خراب کروں۔ میں جانتی ہوں اُس نے بُرا مانا ہو گا۔ کل جنونیوں کی طرح مجھے ٹیلیفون کرے گا۔ الجھی الجھی نظمیں سنائے گا۔ اور میں اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے اس کو منا لوں گی۔

زبیدہ :۔ اگر تم اس سے اتنا گریز کرتی ہو تو ملنا جلنا ترک ہی کیوں نہیں کر دیتیں۔

شفیقہ :۔ ملنے جلنے میں ہرج ہی کیا ہے۔ پھر آدمی دلچسپ ہے۔ سب ٹپ ٹاپ لوگوں سے دوستی ہے۔ ایک دوست ایسا بھی سہی، ذرا ورائٹی رہتی ہے۔

زبیدہ :۔ دیکھو حشمت ادھر دیکھ رہا ہے۔ آؤ اس سے باتیں کریں گے۔

شفیقہ :۔ ارے ہٹاؤ۔ تم مجھے بدنام کراؤ گی۔ تم بھی نہ دیکھو ادھر۔ (لوگوں کے قہقہے بدستور جاری رہتے ہیں)

شفیقہ :۔ زبیدہ میرا جی الجھ رہا ہے، یہ پروگرام کب شروع ہو گا۔

زبیدہ :۔ پروگرام تو قریب ہو ہی رہا ہے۔ سب لوگ ہنس رہے ہیں۔

شفیقہ :۔ مجھے تو اس حشمت پر رہ رہ کر غصّہ آ رہا ہے۔

زبیدہ :۔ مگر دیکھو وہ کس اطمینان سے بیٹھا مسکرا رہا ہے۔

شفیقہ :۔ مسکرا رہا ہو گا۔

زبیدہ :- کیوں، بیچارے حشمت کے پیچھے پڑ گئیں۔ اور عارف کا موڈ بھی کیا خراب ہے مزے سے باتیں کر رہا ہے زلیخا اور اس کے شوہر کے ساتھ۔

شفیقہ :- زبیدہ میرا جی بہت گھبرا رہا ہے۔ چلو یہاں سے۔

زبیدہ :- پاگل ہوئی ہو۔

شفیقہ :- نہیں، مگر ہو جاؤں گی۔ یہ حشمت مجھے کس طرح گھور رہا ہے۔ اف! زلیخا کیسے قہقہے لگا رہی ہے۔ مگر دیکھو۔ دیکھو۔ زبیدہ۔ عارف پھر مجھے دیکھ رہا ہے۔

زبیدہ :- تمھیں کیا ہو گیا ہے۔ اچھی خاصی سنجیدہ عورت ہو کر احمقوں کی سی باتیں کر رہی ہو۔

شفیقہ :- ہاں مصیبت یہی ہے کہ میں بیک وقت احمق بھی ہوں اور سنجیدہ بھی۔

زبیدہ :- میں تو سمجھتی تھی کہ تم صرف سلیم سے محبت کرتی ہو۔

شفیقہ :- سلیم! تم نے یکایک دوسرا موضوع چھیڑ دیا۔

زبیدہ :- کیوں، کیا تم اس سے محبت نہیں کرتیں۔

شفیقہ :- کبھی کرتی تھی۔ مگر کیا ملا مجھے اس سے محبت کر کے۔ محرومی، ناکامی، بدنامی، اس نے میرے خلوص کو ٹھکرا دیا۔ میں نے پھولوں کے بدلے خار چنے۔ اب میری محبت محدود نہیں۔ میں ہر خار کو پھول سمجھ کر چن لیتی ہوں اور دانستہ فریب کھاتی ہوں۔ مجھے اپنی روح کو اذیت دینے میں مزا آنے لگا ہے۔ محبت! ہنستی ہے! اگر میری وارفتہ مزاجی سے پوچھو تو میں ہر شخص سے محبت کرتی ہوں۔ مجھے کسی کے بال اچھے لگتے ہیں، کسی کی رومانی آنکھیں، کسی کا قد، تو کسی کی لچھے دار باتیں، کسی کی خوشامدیں، کسی کی سپردگی، کسی کی بیزاری، میں ہر چیز میں لذّت محسوس کرتی ہوں اور اپنی تفریح کا سامان ڈھونڈھ لیتی ہوں۔ مگر میری سنجیدگی سے پوچھو تو مجھے ان سب چیزوں سے نفرت ہے۔

زبیدہ :- نفرت؟

شفیقہ :- ہاں نفرت، بے انتہا نفرت، مجھ سے کوئی محبت نہیں کرتا، میں کسی سے محبت نہیں کرتی، لیکن ان سب چیزوں سے نفرت کرتے ہوئے بھی میں ان سے گریز نہیں کر سکتی۔

زبیدہ :- کیوں؟

شفیقہ :۔ میں نفرتوں اور حماقتوں کے طوفانوں میں کھوئی رہنا چاہتی ہوں تنہائی میں اپنی محرومیوں کا تصوّر کر کے گھٹ گھٹ کر مرنا نہیں چاہتی۔ مجھے سکون سے چڑ ہے، جمود سے نفرت ہے۔

زبیدہ :۔ جمود اور تمھاری زندگی میں!

شفیقہ :۔ ہاں زبیدہ، میں ایک زندہ لاش ہوں۔ اب سے دس سال پہلے میرے والدین نے ایک پتھر سے شادی کر کے مجھے ایک ریگستان میں ڈال دیا تھا۔ ساجد پتھر ہے۔ ایک عالی شان چٹان کا پتھر ـــــ جو ریگستان میں سینہ تانے کھڑا ہے اور بگولے جس سے ٹکرا ٹکرا کر دم توڑ دیتے ہیں۔ میں مدتوں اس پتھر کے قدموں میں بے حس وحرکت پڑی رہی اس اُمید میں کہ شاید پتھر کے جگر سے کونپلیں پھوٹیں، شاید ساجد میرے احساسات کو سمجھے۔ شاید بادِصبا کا کوئی جھونکا میرے ہونٹوں پر تبسم کی لہر دوڑا دے، میں اپنے آپ کو خزاں رسیدہ پھول نہ سمجھوں جسے سلیم کی بے اعتنائی نے جھلسا دیا تھا۔ میں شادی کے بعد اپنی دیرینہ محبت کی محرومیوں کے احساس کو ختم کر دینا چاہتی تھی۔ مگر۔ . . . .

زبیدہ :۔ مگر کیا؟

شفیقہ :۔ مگر ساجد نے ایک لمحہ کے لیے بھی مجھے وہ پیار نہ دیا جس کی مجھے تمنا تھی۔ وہ ایک بااصول اور حاکم شوہر ہے اور بس۔ میں جان گئی ہوں کہ اس ریگستان میں کوئی نخلستان نہیں۔ یہاں ریت ہے، پتھر ہیں، بگولے ہیں۔ بگولے جو ریت کے سینہ میں زندگی کی روح پھونکتے ہیں، عارف، سلیم، زلیخا، سب میری زندگی میں بگولے بن کر آتے ہیں۔ میں ان سے محبت کرتی ہوں کیونکہ یہ بگولے اپنے طمانچوں سے مجھ میں زندگی کی حرارت پیدا کرتے ہیں۔ میں ان سے نفرت کرتی ہوں کیونکہ یہ آتش نفس بگولے مجھے جھلسا دینا چاہتے ہیں۔

زبیدہ :۔ دیکھو حشمت تمھیں دیکھ رہا ہے۔

شفیقہ :۔ حشمت مجھ سے محبت نہیں کرتا۔ مجھ سے نفرت بھی نہیں کرتا۔ وہ نہ موجِ صبا ہے نہ بگولہ (زلیخا کی ہنسی کی آواز) یہ زلیخا ہنس رہی ہے۔ اُف طنز کے یہ تیز نشتر۔ یہ تند بگولے۔ زبیدہ اب میں یہ طمانچے نہیں سہہ سکتی۔ مجھے حشمت کے پاس لے چلو۔ میں

اس خاموش درخت کے سایہ میں بیٹھ کر تھوڑی دیر سستانا چاہتی ہوں۔

زبیدہ :۔ لیکن سوسائٹی! لوگ انگلیاں اٹھائیں گے کہ شفیقہ ایک بے ہنگم اور لاابالی شاعر سے جسے سوسائٹی کے ایٹی کیٹ بھی نہیں آتے حشمت سے باتیں کرتی ہے۔ عارف کیا سوچے گا جسے خوش کرنے کے لیے تم کچھ بھی کرنے کو تیار رہتی ہو۔

شفیقہ :۔ کچھ بھی سوچے۔ اگر اس کے پاس میرے لیے اتنا وقت بھی نہیں کہ دو باتیں کر سکے تو میں بھی اسے جلانے کے لیے حشمت سے ہنس ہنس کر باتیں کر سکتی ہوں اور جو بکھا پن حشمت میں ہے وہ عارف میں کہاں۔ (پھر زلیخا اور عارف کی ہنسی کی آواز آتی ہے) اٹھو یہاں سے۔ اب میں اور برداشت نہیں کر سکتی (دونوں کے جانے کی آواز)

___ حشمت آہستہ آہستہ گنگنا رہا ہے اور انگلیوں سے دھیرے دھیرے میز بجا رہا ہے۔

"زندگی لہر ہے سمندر کی"

شفیقہ :۔ ہلو حشمت۔

حشمت :۔ ہلو مسز ساجد! آئیے۔ مزاج شریف۔ زہے نصیب۔ تشریف رکھیے۔

شفیقہ :۔ حشمت! تم کیسے اجنبی کی طرح باتیں کر رہے ہو۔

حشمت :۔ ہاں میں اس محفل میں اجنبی ہی ہوں۔ اس بورژوا سوسائٹی میں جہاں لوگ ایک دوسرے کو پہچانتے بھی نہیں۔

شفیقہ :۔ حشمت! تم ....

حشمت :۔ جہاں لوگ ایک دوسرے کے محبوب، اور ایک دوسرے کے شوہر چھیننے کا دلچسپ کھیل کھیلتے ہیں۔ ایک دوسرے کو ذہنی اذیت پہنچا کر لذت حاصل کرتے ہیں۔ یہ بے روح انسان مجھے "ہلو، ہلو" کرنے کی مشینیں نظر آتے ہیں۔ وہی نپے تلے لہجے اور ایٹی کیٹ کے سانچے میں ڈھلے ہوئے فقرے۔

شفیقہ :۔ میں اس وقت تمھارے پاس فلسفہ کا سبق پڑھنے نہیں آئی ہوں۔

حشمت :۔ اگر اپنے صحیح احساسات بیان کرنا اس سوسائٹی کے ایٹی کیٹ کے خلاف ہے تو میں خاموش ہوا جاتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں مجھے اس پارٹی میں آنے کے لیے کسی نے غلطی سے کارڈ بھیج دیا۔ میں چلا آیا تھا اس لیے کہ کچھ پرانے دوستوں سے ملاقات ہو جائے گی مگر اس ماحول میں آکر لوگ اس قدر بدل جاتے ہیں۔ یہ میں نہیں جانتا تھا۔

شفیقہ :۔ مجھے تمھارا گفتگو کا یہ لہجہ قطعاً پسند نہیں۔
حشمت :۔ تو میں کیا کروں۔ میرا لہجہ ہی ایسا ہے۔ میں خواہ مخواہ میٹھی میٹھی باتیں نہیں کر سکتا۔
شفیقہ :۔ مجھے اُمید نہ تھی کہ تم بھی مجھ سے ایسا سلوک کرو گے۔ مجھے سمجھنے کی کوشش کرو حشمت! مجھے تمھاری نظمیں پسند ہیں۔
حشمت :۔ میری نظموں کا ذکر فضول ہے اس وقت۔ اور آئندہ اپنی کوئی نظم تمھیں سنانے سے پہلے تمھیں سمجھنے کی کوشش کروں گا اور سوچوں گا کہ میری کھردری نظمیں تمھارے ریشمیں بیڈ روم میں پڑھی جا سکتی ہیں یا نہیں۔
شفیقہ :۔ چلو زبیدہ میں یہ بے عزتی نہیں برداشت کر سکتی (اور دوسری طرف کو چل پڑتی ہے۔ ہجوم میں سے زلیخا کے قہقہوں کی آواز بلند ہوتی رہتی ہے)
زبیدہ :۔ حشمت تم سے بہت برہم ہے۔
شفیقہ :۔ ہونہہ۔ مجھے کیا پرواہ۔ ایسے کتنے شاعر، کتنے مصوّر، کتنے فنکار میری زندگی میں آتے جا رہے رہے ہیں۔ میرے پاس دولت ہے۔
زبیدہ :۔ اور شاید دولت کے بل پر شاعروں اور فنکاروں کے جذبات سے کھیل کر تمھیں لذّت ملتی ہے۔
شفیقہ :۔ شاید! زبیدہ آؤ اس بالکنی میں کھڑے ہوں۔ سامنے سمندر موجیں مار رہا ہے۔
(قدموں کی آواز۔ سمندر کی لہروں کا شور ابھرتا ہے)
شفیقہ :۔ ہاں آؤ، میں ان بگولوں کے طمانچے کھا کھا کر بے حال ہو گئی ہوں۔ اور سمندر کی لہروں میں کھو جانا چاہتی ہوں۔
زبیدہ :۔ کیا زندگی کی رنگا رنگیوں سے اکتا گئی ہو۔
شفیقہ :۔ زندگی —— نہیں نہیں —— مجھے زندگی کی رنگینیوں سے پیار ہے۔ میں زندہ رہنا چاہتی ہوں۔ چاہے بگولوں کے طمانچے ہی کھانے پڑیں۔
(ہال میں ہل چل سی ہوتی ہے اور اسٹیج پر سازندے آتے ہیں۔ اور پروگرام طلعت محمود کے گانے سے شروع ہوتا ہے)
زبیدہ :۔ تو پروگرام شروع ہو گیا۔

شفیقہ :۔ دیکھو دیکھو۔ طلعت کیسا اسمارٹ لگ رہا ہے سامنے بیٹھا ہوا۔ اس کی مسکراہٹ سے کیسی ٹھنڈک محسوس ہوتی ہے۔

زبیدہ :۔ (ہنس کر) تمھارے خیال میں یہ بگولہ ہے یا پتھر یا بادِ صبا۔

شفیقہ :۔ تم نے بھی کیا سوال کیا ہے۔ پھر سوچیں گے فی الحال تو گانا سنیں۔ طلعت گاتا ہے۔

تصویر تری دل مرا بہلا نہ سکے گی

(آہستہ آہستہ فیڈ آؤٹ)

●

غنچہ پھر لگا کھلنے

(ریڈیائی ڈرامہ)

کردار :

- خالد : ایک سوشل ورکر۔ عمر تقریباً ۶۰ سال
- فرحت۔ خالد کی مرحومہ بیوی
- سلمٰی ۔ خالد کے جوانی کے دنوں کی دوست
- رخسانہ۔ خالد کی بیٹی۔ عمر ۲۱ سال
- مالی ۔ بوڑھا

(زمانہ: آزادی کے بیس بائیس سال بعد)

"آزادی بار بار اپنے پروانوں کا امتحان لیتی ہے۔ آزادی کے تحفظ کے لیے آج بھی اہلِ وطن کے اتفاق و اتحاد کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی پہلے تھی۔ سامراجی قوتوں کے بوئے ہوئے فرقہ پرستی کے کانٹے آج بھی وطن کے باغ میں جگہ جگہ سر اٹھا رہے ہیں۔ انھیں اکھاڑ پھینکنا ملک کے امن و سلامتی کے لیے ضروری ہے۔ اور اس کے لیے آج ان تھک کام کی ضرورت ہے، مگر اب میرے قویٰ مضمحل ہو گئے ہیں۔"

(اس ڈرامے کا ایک اقتباس)

غنچہ پھر لگا کھلنے

(ایسا سنگیت فیڈ ان ہوتا ہے جو رات کے سناٹے اور سکون کو ظاہر کرتا ہو۔ سنگیت تیس سکنڈ کے بعد پس منظر میں چلا جاتا ہے اور دور سے کتوں کے بھونکنے کی ہلکی آواز ابھرتی ہے ـــــ اور کسی کے خراٹوں کے ساتھ سونے کا تاثر پیش کیا جاتا ہے ـــــ پھر ستار پر ایک تیز سنگیت کی لہر گویا ماحول کو جھنجھوڑ کر فیڈ آؤٹ ہو جاتی ہے)

فرحت :۔ سو رہے ہو ـــــ دیکھو ـــــ میں آئی ہوں۔

خالد :۔ کون ـــــ ؟

فرحت :۔ بھول گئے۔

خالد :۔ تم ـــــ فرحت تم ـــــ نہیں ہیں کیسے بھول سکتا ہوں۔ تم تو ہر وقت ـــــ اٹھتے بیٹھتے ـــــ سوتے جاگتے ـــــ گویا میرے ساتھ رہتی ہو ـــــ تمھاری یاد میری زندگی ہے۔

فرحت :۔ تو پھر یہ دوری ختم کیوں نہیں کر دیتے ـــــ آؤ ـــــ سچ مچ میرے قریب آؤ۔

خالد :۔ ہوں ـــــ ہاں . . . .

فرحت :۔ آج میں بہت خوش ہوں۔ تم نے میری وہ آخری آرزو بھی پوری کر دی جس

کی خاطر میں نے آج تک تمہاری فرقت گوارا کی۔ اب . . . .

خالد:۔ یہ تم ــــ تم کیا کہہ رہی ہو۔ فرحت ــــ فرحت ــــ ارے تم کہاں چلی گئیں ــــ فرحت ــــ فرحت . . . . . .

دستار پر موسیقی کی تیز لہر ابھر کر ڈوب جاتی ہے ــــ دور سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں ــــ خراٹوں کی آواز ــــ پھر سرود پر گمبھیر سُر جاگتے ہیں اور آواز ابھر کر پھر پس منظر میں چلی جاتی ہے)

سلمٰی:۔ (فیڈان) خالد! تم نے پھر میرے خط کا جواب نہیں دیا۔ اس لیے آج میں خود آئی ہوں ــــ بولو۔

خالد:۔ کیا بولوں۔ کہاں تم۔ کہاں میں ــــ سوچو تو۔ ہم دونوں کے درمیان کتنا فاصلہ ہے ــــ چاندی کی مضبوط دیوار بیچ میں ہے۔

سلمٰی:۔ پھر وہی جلی کٹی باتیں۔

خالد:۔ سلمٰی یہ سماج۔ ۔ ۔

سلمٰی:۔ سماج۔ سماج۔ سماج۔ مجھے نفرت ہوگئی ہے اس لفظ سے۔

خالد:۔ تو نفرت کا عملی ثبوت دو۔ اور اپنے ماحول کو چھوڑ کر میرے پاس چلی آؤ۔

سلمٰی:۔ اف۔ تم جانتے ہو۔ یہ میں نہیں کر سکتی۔ میں اپنی ایک زندگی کے لیے پورے خاندان کی زندگی خراب کرنا نہیں چاہتی۔ میں ابا جان کی مرضی کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہتی۔

خالد:۔ کیونکہ تمہارے ابا دولت مند ہیں۔ ان سے دور ہونے کے بعد ان کی دولت کے سائے بھی تم سے دور ہو جائیں گے اور باقی رہ جائے گی ایک شاعر کی روکھی پھیکی محبت ــــ جد و جہد سے بھرپور زندگی ــــ اس لیے تم چاہتی ہو کہ میں تمہیں صرف خط لکھتا رہوں ــــ خط جن میں ذکر ہو تمہیں پانے کی تمنّا کا ــــ تعریف ہو تمہارے حسن کی ــــ تذکرہ ہو تمہاری ریشمی زلفوں کا ــــ اور تم اپنی خلوت میں ان خطوں کا لطف اٹھایا کرو۔

سلمٰی:۔ جو کچھ چاہو کہہ لو ــــ مگر خالد! تم یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ شادی کرنا والدین کے اختیار میں ہے مگر محبت کی شمع جلائے رکھنا تو ہمارے بس میں ہے ــــ اور

پھر ہماری محبت عام انداز سے مختلف ہے۔ ہم نے ہوس پرستی نہیں، محبت کی ہے۔ ہم نے اس لیے ایک دوسرے کی تمنا کی ہے کہ ہمارے شوق ایک ہیں ہیں ذہنی طور پر ایک دوسرے کے کاموں سے دلچسپی ہے۔ ہم قدم ملا کر چلیں تو ہماری منزل....

خالد:۔ یہ صرف باتیں ہیں۔ تم محبت کو چاندی کی ترازو میں تولتی ہو، تم چاہتی ہو کہ تمھیں پانے کے لیے میں تمھارے والد کی دولت کو سجدہ کروں۔ لیکن سلمیٰ! مجھے تمھاری محرومی گوارا ہے، مگر تمھارے مغرور والد کے سامنے جھکنا اور ان کے اشاروں پر چلنا منظور نہیں۔ عزت نفس گنوانے کے بعد میرے پاس کیا رہ جائے گا ـــــ تم تو یہ رومان پرور دن گزارنے کے بعد کسی امیرزادے کی خواب گاہ کی زینت بن جاؤگی اور میں.....

سلمیٰ:۔ یہ تو وقت ہی بتلائے گا ـــــ اس وقت تو میں صرف یہ کہہ سکتی ہوں کہ تمھیں میرے خلوص پر شبہ کرنے کا کوئی حق نہیں۔ (آواز فیڈ آوٹ)

سلمیٰ:۔ مگر تم چلی کہاں ـــــ سنو تو.....

(سرود اور ستار پر گت بجتی ہے ـــــ اور خالد جھرجھری لے کر جاگتا ہے پس منظر میں موسیقی جاری رہتی ہے)

خالد:۔ اف ۔ یہ خواب ۔ میں سو رہا ہوں یا جاگ رہا ہوں، کچھ سمجھ میں نہیں آتا ـــــ میرا ماضی میرا پیچھا کر رہا ہے ـــــ کیوں ـــــ

جہانگیرآباد چھوڑے ہوئے ایک زمانہ ہو گیا ـــــ اب نہ وہ محفلیں ہیں نہ وہ جہانگیرآباد ـــــ نہ وہ وعدوں کا خمار ہے نہ محبت کے قول و قرار ـــــ نہ کسی کی شکایت، نہ کسی کا انتظار ـــــ وقت گزر گیا اور دل پر اپنے قدموں کے دھندلے نشان چھوڑ گیا ـــــ فرحت ایک وفا شعار بیوی کی طرح اپنا فرض ادا کرتی ہوئی زندگی کی منزل سے گزر چکی ہے ـــــ سلمیٰ نے شادی ہی نہیں کی ـــــ وہ قومی خدمت کرتے کرتے بوڑھی ہو چکی ہے ـــــ اور میں ـــــ کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ میں بھی عشق کی وادیوں سے گزرا تھا ـــــ

(پس منظر کی موسیقی ہلکی ہلکی شہنائی میں بدل جاتی ہے)

فرحت ایک روایتی بیوی کی طرح میری زندگی میں آگئی تھی ـــــ مگر جس کے آنے

ہی میرے ویرانے کا ذرہ ذرہ پھول بن گیا تھا ــــــ جس کے آنچل میں میں اپنی تمام بیتا بیاں اور ناکامیاں ڈال کر ہر ایک غم بھول گیا تھا ــــــ اس عورت کو بھی موت نے مجھ سے چھین لیا۔

(موسیقی بدلتی ہے ــــــ اور ذہنی خلجان کو پیش کرنے والا میوزک ماحول پر چھا جاتا ہے)

لیکن ــــــ یہ خواب ــــــ ان خوابوں کی تعبیر کیا ہوگی ــــــ صبح رخسانہ کی سالگرہ ہے ــــــ شاید اسی احساس نے میری روح کا ساز چھیڑا ہو۔

(پس منظر کی موسیقی کی آواز ابھرتی ہے ــــــ اور پھر اس میں چڑیوں کی چہکار مل کر ابھرتی ہے ــــــ مرغ کی اذان اور چڑیوں کی آوازوں کے ساتھ ستار پر بھیرویں کا الاپ ہوتا ہے)

خالد:۔ (انگڑائی لینے کا تاثر) صبح ہوگئی ــــــ اللہ اللہ! کتنے حسین نظارے ہیں۔ کسی شاعر نے ایسے ہی عالم میں کہا ہوگا۔

ہم ایسے اہلِ نظر کو ثبوتِ حق کے لیے
اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

صبح ــــــ اور بہار کی صبح ــــــ کتنے افسانے لکھے ہیں ان گل بوٹوں پر۔ ان پھولوں کے پہلو میں کتنے دل مسکرا رہے ہیں۔ کتنی نئی آرزوئیں مچل رہی ہیں۔ ــــــ اور انھیں پھولوں کو دیکھ کر کتنے مندمل زخم ہرے ہوگئے ہوں گے۔

یہ پھول ــــــ شاید یہ پھول زندگی کا دھڑکتا ہوا دل ہیں جس میں خوشی اور غم ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔

مالی:۔ (آواز نیڈ ان) سرکار سلام۔

خالد:۔ کیا ہے مالی۔

مالی:۔ سرکار آپ کی خاص کیاری میں آج گلاب کی کلیاں کھل گئی ہیں۔

خالد:۔ ہوں۔کلیاں کھل گئیں ــــــ غنچہ پھر لگا کھلنے . . . . .

مالی:۔ کیا فرمایا سرکار!

خالد:۔ کچھ نہیں۔

مالی :۔ سرکار یہ پھول گلدان میں لگا دوں۔

خالد :۔ نہیں۔ ایک خوبصورت گلدستہ بنا دو۔ اور پھر رخسانہ کو میرے پاس بھیج دینا۔

مالی :۔ بہت اچھا۔

خالد :۔ سنو۔ تم اسے نہ بلانا۔ میں خود ہی اس کے کمرے میں جاؤں گا۔ گلدستہ بنا لاؤ۔

(ستار کی آواز فیڈ ان ہوتی ہے۔ اور کچھ دیر ستار بجتا ہے)

خالد :۔ (آواز فیڈ ان) ماشاء اللہ (ستار اک دم رک جاتا ہے)

رخسانہ :۔ ابا جان!

خالد :۔ ہاں بیٹی۔ مجھے نہیں معلوم تھا تم اتنا اچھا ستار بجاتی ہو۔

رخسانہ :۔ آداب۔ آپ کب آ گئے۔

خالد :۔ ابھی ایک دو منٹ پہلے۔ سالگرہ مبارک۔

رخسانہ :۔ شکریہ۔ کتنے خوبصورت پھول ہیں۔

خالد :۔ تمھیں پسند آئے۔

رخسانہ :۔ بہت۔

خالد :۔ آج تمھاری اکیسویں سالگرہ ہے۔ بیٹی! آج تم زندگی کی ایک اہم منزل پر آگئی ہو۔ آج کی صبح تمھیں نئی ذمہ داریوں کا احساس دلانے کے لیے آئی ہے۔ آج کے پھول تمھاری زندگی کی بہار کے نئے پھول ہیں۔ آج تم بڑی ہو گئی ہو۔

(آواز فرطِ مسرت سے بھرا جاتی ہے)

رخسانہ :۔ ابا جان ـــــ ابا جان۔

خالد :۔ کچھ نہیں بیٹی! یہ تو خوشی کے آنسو ہیں اس دن کے انتظار میں میں نے اکیس سال گزارے ہیں ـــــ اور آج میری آنکھوں میں آنسو آ گئے تو۔ تعجب کیا۔ میں کتنا خوش ہوں کہ آج اپنے فرض سے سبکدوش ہو گیا بیٹی ـــــ میں صبح کا چراغ ہوں۔

رخسانہ :۔ ابا جان! ایسا نہ کہیے۔

خالد :۔ کیوں! کیا یہ غلط ہے کہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔ میری عمر کا بہترین حصہ گزر چکا ہے۔

رخسانہ :۔ لیکن زندگی کا ہر لمحہ قیمتی ہوتا ہے۔

خالد :۔ ہاں ہوتا تو ہے ـــــ لیکن کچھ لمحے ایسے بھی ہوتے ہیں جو جاوداں ہو جاتے ہیں۔ ایسے لمحے جن کے تصوّر میں انسان پوری زندگی گزار سکتا ہے۔ میں بھی ایسے ہی چند لمحوں کے سہارے جی رہا ہوں۔

رخسانہ :۔ زندگی کے بارے میں مختلف فلسفے ہیں ـــــ مثلاً۔

خالد :۔ (ہنس کر) بیٹی میں جانتا ہوں کہ تم فلسفے کی طالبہ ہو ـــــ لیکن زندگی کا تجربہ اور بات ہے اور فلسفہ اور ـــــ فلسفی شاعر اقبال ہی نے تو کہا ہے ؎

ہے فلسفہ زندگی سے دوری
ہے اس کی حیات ناصبوری

بہر حال آج سورج کی پہلی کرن اس لمحے کو اپنے دامن میں سمیٹ لائی جو میرے تصوّر میں کئی سال سے جگمگا تا رہا تھا، آج تمھاری اکیسویں سالگرہ ہے۔ تم ایک باپ کی خوشی کا اندازہ نہیں کرسکتیں۔

رخسانہ :۔ ابا جان۔

خالد :۔ آج میں تمھیں ایک انمول تحفہ دینا چاہتا ہوں۔

رخسانہ :۔ کیا۔

خالد :۔ ابھی بتلاؤں گا۔ ویسے کیا پروگرام ہے آج۔

رخسانہ :۔ کوئی خاص پروگرام نہیں۔ میری آٹھ دس سہیلیاں آئیں گی۔ کچھ گانے کا پروگرام ہوگا۔

خالد :۔ آج میں نے بھی کچھ لوگوں کو کھانے پر بلایا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آج تمھاری سالگرہ پارٹی ایک شاندار پارٹی ہو ـــــ اور ہاں ڈاکٹر ریاض کو بھی ضرور بلانا۔

رخسانہ :۔ جیسا آپ کا حکم۔

خالد :۔ مجھے بھی وہ لڑکا بہت پسند ہے ـــــ آج میں اس فرض سے بھی سبکدوش ہونا چاہتا ہوں۔

رخسانہ :۔ (مچل کر) ابا جان۔

خالد : بیٹی ۔ ۔

رخسانہ :۔ کیا سوچنے لگے اب۔
خالد :۔ میں آج تمھیں کچھ اہم باتیں بتلانا چاہتا ہوں، مگر سوچتا ہوں کہ کہیں تم رنجیدہ نہ ہوجاؤ۔ ویسے میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم عام لڑکیوں سے مختلف ہو اور جذبات کی رو میں نہیں بہتی ہو۔
رخسانہ :۔ یہ میری خوش نصیبی ہے کہ آپ ایسا سمجھتے ہیں۔
خالد :۔ تمھیں یہ معلوم ہے کہ یہ مکان تمھارے نام ہے۔ بینک میں جو تھوڑا بہت روپیہ ہے وہ بھی تمھارے نام ہے۔

رخسانہ :۔ جی۔
خالد :۔ تم اس گھر کے ذرہ ذرہ سے واقف ہو۔ لیکن میرے بارے میں کچھ باتیں نہیں جانتیں۔
رخسانہ :۔ کیا فرماتے ہیں آپ۔ ایک بیٹی اپنے باپ کو جتنا جان سکتی ہے اس سے کچھ زیادہ ہی جانتی ہوں میں آپ کو۔ اور پچھلے تین سال سے تو میں آپ کی پرائیویٹ سکریٹری کی طرح کام کر رہی ہوں۔
خالد :۔ ہاں تم یہ جانتی ہو کہ میں اس شہر کا معزز آدمی مانا جاتا ہوں۔ یہاں کے سماجی اور سیاسی حلقوں پر میرا گہرا اثر ہے، میں نے اپنی زندگی قومی تعمیر کے کاموں کے لیے وقف کر دی ہے ـــــ یہ سب تم جانتی ہو ـــــ لیکن ـــــ خیر ـــــ لو یہ چابی۔ اور میری الماری میں سے آبنوس کا صندوقچہ نکال کر لاؤ۔
رخسانہ :۔ لائیے۔

(قدموں کی چاپ۔ الماری کھولنے کی آواز)

اس صندوقچے میں کیا ہے ابا جان!
خالد :۔ میرا ماضی ـــــ کبھی کبھی جب میں قومی زندگی کی مشین سے اکتا جاتا ہوں تو کچھ دیر کے لیے اپنے ماضی میں کھو جاتا ہوں۔ کئی بار میں نے اس صندوقچے کی چیزوں سے زندگی کی نئی حرارت پائی ہے ـــــ کھولو اس صندوقچے کو۔
رخسانہ :۔ (صندوقچہ کھولنے اور کاغذ الٹ پلٹ کرنے کی آواز) یہ سب کیا۔ (ہنس کر) واہ ابا جان! میں تو سمجھتی تھی کوئی خاص چیز ہوگی۔ اس میں تو کچھ فوٹو۔ کچھ کٹے پھٹے کاغذ۔

اور یہ شاید پرانے خط۔

خالد :۔ ہاں کچھ فوٹو۔ کچھ کاغذ۔ اور کچھ پرانے خط۔ یہی میری زندگی کا سرمایہ ہے جسے میں نے اس قدر سنبھال کر رکھا ہے۔ تمہارے ابا پاگل ہیں نا بیٹی۔

رخسانہ :۔ یہ تو میں نہیں کہتی ـــــ لیکن یہ فوٹو کس کا ہے۔

خالد :۔ میرا۔

رخسانہ :۔ آپ کا۔

خالد :۔ ہاں تیس پینتیس سال پرانا فوٹو ہے۔

رخسانہ :۔ (ہنس کر) بڑے ٹھاٹ دار لباس میں رہتے تھے آپ ـــــ لیکن میں نے آپ کو کبھی سوٹ پہنے نہیں دیکھا ـــــ وہی کھدر کا کرتہ۔ پاجامہ اور شیروانی۔

خالد :۔ ہاں، اب یہی زیب دیتا ہے۔

رخسانہ :۔ یہ خط۔ یہ خط کیسے ہیں۔

خالد :۔ یہ خط۔ اب صرف خط ہیں۔ ان کی کوئی اہمیت نہیں، لاؤ مجھے دو۔

رخسانہ :۔ لیجیے۔

(خط پھاڑنے کی آواز)

آپ نے تو پھاڑ ہی دیے۔

خالد :۔ اور کیا کرنا تھا اب ان کا۔

رخسانہ :۔ اور یہ کاغذ۔

خالد :۔ انھیں تم چاہو تو اپنے پاس رکھو۔ یہ میری نظموں کے مسودے ہیں۔

رخسانہ :۔ (حیرت سے) کیا، آپ کی نظموں کے مسودے۔ آپ شعر بھی کہتے تھے۔

خالد :۔ کہتا تھا کبھی۔

رخسانہ :۔ تعجب ہے۔ مجھے اب تک نہیں معلوم تھی یہ بات۔

خالد :۔ تمھیں بہت سی باتیں نہیں معلوم۔ اور شعر کہے ہوئے تو مجھے پچیس سال ہو گئے۔ وہ نوجوانی کا شوق تھا ـــــ کئی بار سوچا ان نظموں کو ضائع کر دوں ـــــ ان کاغذوں کو ردی کی ٹوکری میں پھینک دوں۔ مگر جب بھی ایسا کرنا چاہا، ہاتھ خود رک گئے، اور ایسا محسوس ہونے لگا جیسے میں اپنا گلا گھونٹ رہا ہوں۔

رخسانہ :۔ (کاغذ الٹ پلٹ کرنے کی آواز) ـــــ نظمیں پڑھتی ہے۔
بیزاری ـــــ آج آئی ہو بہت دیر میں آئی ہو تم۔
(دوسرا کاغذ کھولنے کی آواز) میری آواز سنو۔ نغمہ، جراتِ پرواز سنو ـــــ
میں بھول جاتا اگر وہ لمحہ۔
(پھر کاغذ الٹتی ہے) شبنم شراب شعر شفق صبحِ نوبہار
کیا کیا رکھے ہیں دل نے تری دلکشی کے نام
...... واہ کتنی عمدہ نظمیں اور غزلیں ہیں ـــــ اب میں یہ آپ کو نہیں
دوں گی ـــــ میں یہ نظمیں چھپواؤں گی ـــــ آپ دیکھیے گا تمام ملک میں
حیرت کی لہر دوڑ جائے گی جب لوگوں کو معلوم ہوگا کہ اسٹیج پر خشک سیاسی تقریریں
کرنے والے ہاشمی صاحب ایک رنگین شاعر بھی ہیں۔ آپ کا تخلص کیا تھا۔

خالد :۔ مگر بیٹی! تم ان نظموں کو اپنے پاس ہی رکھنا۔ چھپوانا نہیں۔

رخسانہ :۔ کیوں، ادب اتنی اچھی نظموں سے محروم کیوں رہے۔

خالد :۔ ادب کے بازار میں بہت مال آتا ہے۔ یہ میری ذاتی قسم کی نظمیں ہیں اور ذاتی باتوں کی تشہیر مجھے پسند نہیں ـــــ خصوصاً اس وقت۔

(دونوں ہنستے ہیں)

رخسانہ :۔ اچھا یہ فوٹو کس کے ہیں ـــــ اور یہ کنگن ـــــ ابا ـــــ آپ بولتے کیوں نہیں ـــــ ارے آپ کی آنکھوں میں آنسو!

خالد :۔ ہاں بیٹی ـــــ یہ تمھاری ماں کے فوٹو ہیں۔

(موسیقی کی ایک تیز لہر ابھر کر ڈوب جاتی ہے)

رخسانہ :۔ اماں کے فوٹو ـــــ (روتے ہوئے) ـــــ اماں ـــــ اماں ـــــ ابا آپ نے یہ فوٹو مجھے اب تک کیوں نہیں دیے۔ کیوں مجھے ان کی زیارت سے محروم رکھا۔

خالد :۔ اس لیے کہ اس سے پہلے تم ان کی عظمت نہیں سمجھ سکتی تھیں۔ اور مرحومہ کی وصیت کے مطابق مجھے یہ فوٹو اور ان کے یہ کنگن تمھیں آج ہی دینے چاہیے تھے ـــــ اف۔ ان کا وہ نزع کا عالم۔ ادھر سورج ڈوب رہا تھا ـــــ اور ادھر ـــــ

(میوزک کی لہر جو ماضی کی غمگین فضا پیدا کر دے۔)

فرحت :۔ تم ـــــ کہاں ہو ـــــ سرتاج۔ میرے پاس رہو۔

خالد :۔ (آواز میں جوانی) میں تمھارے پاس ہی تو ہوں فرحت ـــــ لو۔ یہ دوا پی لو۔

فرحت :۔ نہیں ـــــ اب دوا اور دعا بے اثر ہے۔ فرشتے لینے آگئے ہیں ـــــ مجھے موت کا ڈر نہیں ـــــ مگر ـــــ شرمندہ ہوں ـــــ اب تمھارے دکھ ـــــ درد میں شریک نہ ہو سکوں گی۔ تم نے۔ تمام عمر ـــــ غم اٹھائے ہیں، اور ـــــ میں بھی تمھیں تنہا چھوڑ کر جا رہی ہوں ـــــ خیر ـــــ مجبوری ہے۔ زندگی ہی نے وفا نہ کی ـــــ ورنہ ـــــ میں . . . . . .

خالد :۔ اتنی افسردہ نہ ہو فرحت ـــــ تم اچھی ہو جاؤ گی۔

فرحت :۔ نہیں، اچھا وعدہ کرو اپنی صحت کا خیال رکھو گے۔

خالد :۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔

فرحت :۔ ایک تکلیف اور دینا چاہتی ہوں۔ (بچے کے رونے کی آواز) اس ـــــ پھول سی جان کا ـــــ اب تمھارے سوا ـــــ کوئی نہیں ہے ـــــ اس کو تکلیف ہو گی تو ـــــ میری روح ـــــ بے چین رہے گی۔

خالد :۔ یہ میرے جگر کا ٹکڑا ہے اور تمھاری محبت کی امانت ـــــ میں اسے ہمیشہ خوش رکھوں گا۔

فرحت :۔ شکریہ ـــــ میرے ہاتھوں سے یہ کنگن اتار لو ـــــ جب یہ اکیس سال کی ہو جائے تو اسے دیدینا ـــــ اچھا سرتاج ـــــ میرا کہا سنا معاف کرنا۔ الوداع۔

(موت کی ہچکی غمگین موسیقی)

خالد :۔ فرحت۔ فرحت۔ فرحت۔

(موسیقی بلند ہو کر فیڈ آؤٹ ہو جاتی ہے)

رخسانہ :۔ (روتے ہوئے) اماجان ـــــ اماجان۔ تم مجھے چھوڑ کر کیوں چلی گئیں ـــــ میں اب تک ماں کہہ کر پکارنے کو ترستی ہوں ـــــ اور عمر بھر ترستی رہوں گی۔

خالد :۔ بس۔ رخسانہ بس ـــــ چپ ہو جاؤ۔ تمھاری ماں کی روح بے چین ہو جائے گی۔

رخسانہ :۔ میں خود رونا نہیں چاہتی ـــــ لیکن ان آنسوؤں کا کیا کروں جو امنڈے ہی چلے

آتے ہیں۔ اس دل کا کیا کروں جو قابو ہی میں نہیں آتا۔ میں نے اب تک ماں کی محرومی کا غم محسوس کیا ہے۔ آج وہ غم آنسو بن گیا ہے، (ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے)

خالد :۔ بس چپ ہو جاؤ بیٹی۔ تم نہیں جانتیں کہ میں نے تمھیں خوش رکھنے کے لیے کیا کچھ کیا ہے ——— میں نے اپنی محبت کی تمام کائنات فرحت کے قدموں میں ڈال دی تھی۔ لیکن اس کی عمر نے وفا نہ کی۔ مگر تم ——— تم اس محبت کی یادگار ہو۔ تم میری محبت کا جیتا جاگتا تاج محل ہو۔ مسکراؤ رخسانہ۔

رخسانہ :۔ (اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے) ابا۔

خالد :۔ تمھاری مسرتوں کی خاطر مجھے اپنی زندگی کا انداز بدل دینا پڑا۔ ایک بات جو میں نے آج تک تم سے چھپائی ہے وہ یہ ہے کہ جس دن تمھاری سالگرہ ہوتی ہے اسی دن تمھاری ماں کی برسی . . . . .

رخسانہ :۔ (ایک دم چیخ کر) کیا کہہ رہے ہیں آپ۔ (موسیقی کی تیز لہر)

خالد :۔ یہی کہ جس دن تم پیدا ہوئیں اسی روز تمھاری ماں کا انتقال ہو گیا تھا۔

رخسانہ :۔ اف۔ تو گویا میں اپنی ماں کے مرنے کی خوشیاں مناتی رہی ہوں۔

خالد :۔ نہیں۔ تم نے تو اپنی سالگرہ کی ہی خوشیاں منائی ہیں۔ رنجیدہ مت ہو۔ تم سے محض یہ بات چھپانے کے لیے میں نے اپنا آبائی وطن جہانگیر آباد ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا۔ جب تم ایک سال کی تھیں۔

رخسانہ :۔ کیوں؟

خالد :۔ اس خیال سے کہ بڑے ہو کر مجھ سے نہیں، تو اوروں سے تمھیں یہ ضرور معلوم ہو جائے گا کہ تمھاری تاریخِ پیدائش اور ماں کی تاریخِ وفات ایک ہے، اور پھر شاید تم اپنی سالگرہ پر رنجیدہ ہو جاؤ۔

رخسانہ :۔ اُفوہ۔

خالد :۔ یہاں آکر میں نے اپنی وضع قطع ہی بدل ڈالی۔ آج کے کھدر پوش کے۔ آر۔ ہاشمی کو اس خالد رضا سے کیا نسبت جس کا یہ فوٹو ہے۔

رخسانہ :۔ یہ تو کمال کیا آپ نے۔

خالد :۔ کمال نہیں بیٹی، یہ وقت کی ستم ظریفی ہے۔ ان دنوں آدمی صرف شاعر ہو کر باعزت زندگی نہیں بسر کرسکتا تھا ـــــــ اور تمہاری تعلیم و تربیت کا سوال تھا اس لیے مجھے ادیب سے بزنس مین بننا پڑا۔ مگر شروع ہی سے سماجی کاموں سے دلچسپی تھی اس لیے یہ سلسلہ بھی باقی رہا ـــــــ بلکہ یہاں آکر سماجی اصلاح کے کاموں میں اور زیادہ دلچسپی لینے لگا ـــــــ اور آہستہ آہستہ قومی خدمت میری طبیعت کا ایک جزو بن گئی۔ اور یہ تو تمہیں معلوم ہی ہے بیٹی کہ کس طرح آزادی کی جدوجہد میں شریک رہا ہوں۔

رخسانہ :۔ جی ہاں، یہ کون نہیں جانتا۔

میں اسکول کے زمانے سے ہی کانگریس کے جلسوں میں ذوق و شوق سے شریک ہوتا تھا ـــــــ قومی تحریک زور پکڑتی گئی اور میرا قومی جذبہ بھی پروان چڑھتا گیا۔

(پس منظر سے سنگیت ابھرتا ہے جو انقلابی جدوجہد کو نمایاں کرتا ہے اور انقلاب زندہ باد کے نعرے بھی بلند ہوتے ہیں)

۴۲ء ـــــــ اللہ اللہ۔ کیا زمانہ تھا ـــــــ ایک جوش تھا جو چین کی نیند نہیں سونے دیتا تھا ـــــــ وطن نے ہمیں پکارا تھا ـــــــ جو کچھ نہ کر گزرتے کم تھا ـــــــ انقلاب کی شورشوں سے گزرے جیل کی سختیاں جھیلیں ـــــــ انقلاب کی آگ تیز ہوتی گئی ـــــــ جب بھی آزادی کا مورچہ بنا۔ ہم ایک سپاہی کی طرح میدان میں آگئے۔

(میوزک بلند ہو کر آہستہ آہستہ مسرت آگیں سنگیت میں تحلیل ہوتا ہے اور شہنائی کا سُر بلند ہوتا ہے)

۴۷ء میں آزادی کا پرچم لہرایا۔ جھوم جھوم کر گیت گائے۔ سیکڑوں سال بعد آزادی کا غنچہ کھلا تھا ـــــــ وطن پر نئی بہار آگئی تھی ـــــــ معلوم ہوتا تھا دل ابھی ابھی جوان ہوا ہے۔

(میوزک ابھر کر فیڈ آؤٹ ہو جاتا ہے)

(خالد کھانستا ہے) بیٹی ذرا سا پانی لاؤ۔

رخسانہ :۔ لیجیے اباجان ـــــــ اب آپ اپنی صحت کا بالکل خیال نہیں رکھتے۔

خالد :۔ نہیں بیٹی ـــــــ یہ بات نہیں ـــــــ رات مجھے نیند بہت کم آئی، عجیب عجیب

خواب دیکھتا رہا ــــــ اور یوں بھی اب میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔

رخسانہ:۔ آج آپ کو اپنی عمر کا بہت احساس ہو رہا ہے۔

خالد:۔ وقت کا تقاضہ ہے ــــــ دل میں اب بھی وہی حوصلے ہیں، مگر جسم اور ارادے ہم آہنگ نہیں ہیں۔

رخسانہ:۔ یہ آپ کا خیال ہے، ورنہ لوگ تو آپ کو ایک بڑا قومی کارکن اور رہنما سمجھتے ہیں۔

خالد:۔ ہاں ــــــ مگر میرے نزدیک کچھ ضرورت مندوں کو تھوڑی بہت مالی مدد دینا یا کچھ سماجی کاموں میں مشورے دے دینا کوئی بڑی خدمت نہیں۔

رخسانہ:۔ میں کچھ سمجھی نہیں۔

خالد:۔ شاید میں سمجھا نہیں پایا ــــــ میرا طریقہ سپاہیانہ رہا ہے، مگر آج محسوس ہوتا ہے کہ میں تھک گیا ہوں ــــــ وطن کو نئی تعمیر کے لیے آج بھی اپنے سپوتوں کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی جنگ آزادی کے لیے تھی۔

رخسانہ:۔ میں مانتی ہوں۔

خالد:۔ آزادی بار بار اپنے پروانوں کا امتحان لیتی ہے۔ آزادی کے تحفظ کے لیے آج بھی اہلِ وطن کے اتفاق و اتحاد کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی پہلے تھی۔ سامراجی قوتوں کے بوئے ہوئے فرقہ پرستی کے کانٹے آج بھی وطن کے باغ میں جگہ جگہ سر اٹھا رہے ہیں۔ انھیں اکھاڑ پھینکنا ملک کے امن و سلامتی کے لیے ضروری ہے۔ اور اس کے لیے آج ان تھک کام کی ضرورت ہے، مگر اب میرے قویٰ مضمحل ہو گئے ہیں۔

رخسانہ:۔ لیکن آپ کی رہنمائی میں یہ کام نوجوان کر رہے ہیں۔

خالد:۔ ہاں، لیکن بیٹی! تم میرے جذبات کو سمجھ نہ پاؤ گی ــــــ آج جب کبھی میں اپنے مکان کی چھت سے فولاد کے کارخانے میں کام کرتے ہوئے مزدوروں کو دیکھتا ہوں جو ملک کی صنعتی ترقی میں حصّہ لے رہے ہیں تو مجھے ان پر رشک آتا ہے۔

رخسانہ:۔ کیوں۔

خالد:۔ میں کیوں ان خوش نصیبوں میں شامل نہیں ہوں ــــــ اور میرے تصوّر میں قومی تعمیر کے وہ تمام نقشے ابھر آتے ہیں جو ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلے ہوئے ہیں ــــــ بڑے بڑے باندھ بنائے جا رہے ہیں مگر میں وہاں نہیں ہوں ــــــ نئے نئے کارخانے قائم کیے جا رہے ہیں مگر میں وہاں نہیں ہوں

(اس پس منظر میں بہت ہلکا شور کارخانوں اور مزدوروں کے کام کرنے کا)

رخسانہ:۔ ابا جان! میں سمجھتی ہوں آپ کا یہ احساس غلط ہے ـــــ آپ قومی تعمیر کے ہر مورچے پر ـــــ ہر کارخانے میں ہیں ـــــ آپ بزرگ ہیں۔ آپ نے نئی نسل کو کام کرنے کا راستہ دکھایا ہے، ان کے سامنے اعلیٰ نمونے پیش کیے ہیں۔ یہی آپ کی سب سے بڑی خدمت ہے۔ میں آپ کی بیٹی ہوں، مجھے پڑھا لکھا کر آپ نے اس قابل بنایا ہے کہ میں وطن کی تعمیر کے کاموں میں بھرپور حصہ لے سکتی ہوں، سماجی برائیوں سے لڑ سکتی ہوں۔ آپ نے قومی خدمت کا جو جھنڈا بلند کیا ہے میں اسے لہراؤں گی۔

خالد:۔ بیٹی! میری پیاری بیٹی! میں کتنا خوش نصیب باپ ہوں ـــــ کتنا خوش نصیب۔

رخسانہ:۔ آج میری اکیسویں سالگرہ ہے۔ آپ ہی نے تو کہا تھا کہ آج کی صبح مجھے نئی ذمہ داریوں کا احساس دلانے کے لیے مسکرائی ہے، آج کے پھول میری زندگی کی نئی بہار کے پھول ہیں ـــــ آج میں کتنی خوش ہوں آپ کا یہ تحفہ پا کر۔

مالی:۔ (فیڈ ان) یہ اخبار لیجیے سرکار ـــــ

رخسانہ:۔ ـــــ لاؤ ـــــ (اخبار کے صفحے الٹنے پلٹنے کی آواز) سلمیٰ دانیال کا انتقال۔

خالد:۔ کیا ـــــ کیا ہوا، پھر پڑھو۔

رخسانہ:۔ جہانگیر آباد کی مشہور سوشل ورکر اور ہردلعزیز شخصیت کا حرکتِ قلب بند ہونے سے انتقال ہو گیا۔

خالد:۔ سلمیٰ ـــــ سلمیٰ دانیال کا انتقال ـــــ یہاں بھی مجھے مات ہوئی۔ میرا تو رات ہی ماتھا ٹھنکا تھا ـــــ میرے خواب کی تعبیر مل گئی۔

رخسانہ:۔ ابا جان ـــــ کیسا خواب ـــــ کیا بات ہے ـــــ آپ جانتے تھے سلمیٰ دانیال کو۔

خالد:۔ ہاں۔ جانتا تھا، میری ہم وطن تھیں، قومی کارکن تھیں ـــــ اب تو بوڑھی ہو گئی ہوں گی۔ ـــــ اور ـــــ یوں بھی ـــــ زندگی کا کیا بھروسہ۔ (کھانستا ہے ـــــ اور ایک دم درد سے کراہتا ہے) آہ ـــــ آہ ـــــ بیٹی پانی۔

رخسانہ:۔ ابھی لائی۔

خالد:۔ سلمیٰ تم سرخرو ہوئیں ـــــ اور میں . . . . .

رخسانہ:۔ ابا جان۔ لیجیے ـــــ پانی ـــــ پی لیجیے تو سہی ـــــ کیا ہوا آپ کو۔

خالد:۔ کسی نے ـــــ بہت دور سے بلایا ہے ـــــ اور ـــــ ہم سفر بھی مل گیا۔

رخسانہ :۔ ابا۔

خالد :۔ بیٹی اب اس تیز رفتار ـــــ زندگی کو ـــــ میری ضرورت نہیں۔ اب یہ مشعل تمھارے ہاتھ میں ـــــ تمھیں نے تو کہا تھا۔

رخسانہ :۔ میرا یہ مطلب کب تھا۔

خالد :۔ تم اداس ہو ـــــ میں ان دھندلکوں سے پرے ایک نیا اجالا دیکھ رہا ہوں ـــــ ایک نئی زندگی ـــــ اچھا ـــــ خدا حافظ۔

رخسانہ :۔ (چیخ کر) ابا جان ـــــ ابا جان۔

(دلدوز موسیقی ابھر کر ماحول کا احاطہ کر لیتی ہے اور آہستہ آہستہ فیڈ آؤٹ)

ایک ڈوبتا جزیرہ

(ریڈیائی ڈرامہ)

کردار:۔

- کامران۔ نوجوان شاعر
- رادھیکا۔ کامران کی فین
- شانتا۔ رادھیکا کی جٹھانی
- شنکر۔ رادھیکا کا پتی
- سکھدیو۔ شانتا کا ملازم
- چند آوازیں

"روپیہ کی ضرورت ـــــ اور آپ کو ـــــ (پھر ہنستی ہے) اب میرے پاس آپ کے لیے ایک پیسہ بھی نہیں ہے ـــــ آپ کی اکڑ، خودداری، خودپرستی اور بے نفسی کی جو قیمت میں نے مقرر کی تھی وہ میں ادا کر چکی ـــــ رادھیکا بھی مات کھا چکی اور آپ بھی بے سروسامان ہو چکے۔ اب آپ اپنی لاش واپس لے جا سکتے ہیں ـــــ اس سمندر میں بہت سے جزیرے ڈوب چکے ہیں۔ اب آنکھیں پھاڑے میرا منہ کیا تاک رہے ہیں آپ ـــــ سکھدیو صاحب کو لفٹ تک پہنچا دو۔"

(اس ڈرامے کا ایک اقتباس)

ایک ڈوبتا جزیرہ

(ہیجان انگیز میوزک فیڈان ہوتا ہے اور پھر میوزک کی لہروں میں ڈوبا ہوا واہ واہ۔ کیا خوب۔ اتی سندر کا شور بلند ہوتا ہے جیسے کسی کوی کو بھرے کوی سمیلن میں داد دی جا رہی ہو پھر شور فیڈ آوٹ ہو جاتا ہے اور ہلکی ہلکی آوازیں پس منظر میں چلی جاتی ہیں)

ناظمِ مشاعرہ:۔ بہت سندر ـــــ ابھی آپ نے یووک کوی شری پریم رستوگی کی کویتا کا آنند لیا۔ اب ہندی اردو کے اس گنگا جمنی کوی سمیلن میں اردو کے نوجوان شاعر جناب کامران شیرازی کا کلام سنیے۔ کامران صاحب نوجوان ہیں، خوش فکر ہیں۔ اور آپ کے کلام میں ابھی سے ہی شباب اور انقلاب کی ملی جلی چنگاریاں ہیں ـــ جناب کامران شیرازی۔

(تالیاں)

کامران:۔ حضرات میں ایک قطعہ پیش کرتا ہوں۔

آوازیں:۔ ارشاد ـــ ارشاد۔

کامران:۔ ملاحظہ کیجیے۔

تو روحِ بہارِ لالہ و گل، نورِ مہ و اختر ہے ساقی
میرے شعروں کے دامن میں تیرا ہی پیکر ہے ساقی

لیکن یہ کیسے کہوں تجھ سے اس وقت مرے کاشانے میں
پھولوں کی نازک سیج نہیں، کانٹوں کا بستر ہے ساتھی

آوازیں:۔ واہ واہ ــــ واہ ۔خوب ۔بہت خوب ۔

ایک عورت:۔ واہ ۔ کیا تیور ہیں ۔

دوسری عورت:۔ دل جلا معلوم ہوتا ہے ۔

رادھیکا:۔ جی جی ۔میں نے تو کامران صاحب کو پہلی بار ہی سنا ہے ۔

دوسری عورت:۔ میں نے بھی ۔

رادھیکا:۔ ان شعروں کے پیچھے کیا کیریکٹر ہے ۔

دوسری عورت:۔ اوہو ۔تم تو بس ہر وقت منووگیانک بنی رہتی ہو ۔ ہر آدمی کی نفسیات جاننا چاہتی ہو ۔

رادھیکا:۔ اسی میں تو لطف ہے ۔ مجھے کویوں، شاعروں اور کلاکاروں کی کلا اور کویتا کے پیچھے ان کی چھپی شخصیت کو پڑھنے میں زیادہ مزا آتا ہے، میں تو کامران صاحب کو چائے پر بلاؤں گی ۔

دوسری عورت:۔ اچھا بلا لینا ــــ اب کلام تو سننے دو ۔

کامران:۔ (واہ واہ کے شور میں) آداب عرض ۔ آداب عرض ۔ آداب عرض ۔ ایک نظم سنیے ۔
عنوان ہے ــــ بے نیازی ۔

خرد شکار، محبت نواز دوشیزہ
تو رشکِ حور سہی، پیکرِ بہار سہی
خدائے حسن کی صنعت کا شاہکار سہی
مجھے نہ دیکھ تمنا بھری نگاہوں سے ــــ
دہک رہا ہے ترے رخ پہ خون کا غازہ
سلگ رہا ہے نظر میں غرورِ سرمایہ

آوازیں:۔ واہ واہ ۔ (مشاعرہ کا شور آہستہ آہستہ فیڈ آؤٹ ہو جاتا ہے ــــ ستار پر چند سکنڈ کے لیے گت بجتی ہے، فون کی گھنٹی بجتی ہے)

ایک آواز:۔ ہلو ــــ جی ہاں ــــ ہیں ــــ کامران صاحب آپ کا فون ۔

کامران :۔ فرمائیے ـــــــ میں کامران بول رہا ہوں۔
رادھیکا :۔ میں نے آپ کے کلام کی داد دینے کے لیے ٹیلی فون کیا۔
کامران :۔ شکریہ۔ مگر۔ کونسا کلام۔
رادھیکا :۔ جناب وہی مشاعرہ والا ـــــــ جس میں آپ کسی محبت نواز دوشیزہ کو ڈانٹ رہے تھے۔
کامران :۔ جی۔ وہ۔
رادھیکا :۔ برا نہ مانیے تو میں کہوں گی کہ دل کے بھڑاس نکال رہے تھے۔ ورنہ کہیں کوئی شاعر اپنی محبوبہ کو ڈانٹ سکتا ہے۔
کامران :۔ (ہنس کر) اصل میں اس نظم میں . . . . .
رادھیکا :۔ اس نظم میں کیا ہے۔ یہ میں سمجھتی ہوں۔
کامران :۔ کیا سمجھتی ہیں آپ!
رادھیکا :۔ اتنی آسانی سے نہیں سمجھاؤں گی ـــــــ آج شام غریب خانے پر چائے پیجیے۔
کامران :۔ وہ۔ آج تو۔ . . . .
رادھیکا :۔ گھبرائیے مت۔ میں محبت نوازی نہیں کروں گی۔ میرے پتی دیو کو بھی آپ سے مل کر خوشی ہوگی۔ ہمارے گھر میں سب لوگ شعروشاعری کے شوقین ہیں۔ مگر آپ سے شعر نہیں سنیں گے۔ صرف باتیں کریں گے۔ چائے پئیں گے۔
کامران :۔ یہ تو بہت اچھا ہے۔ میں حاضر ہونگا۔ پتہ بتا دیجیے۔ جی ـــــــ جی،

(سنگیت ابھرتا ہے پھر سمندر کی لہروں کا ہلکا ہلکا شور
کال بیل کی آواز ـــــــ دروازہ کھولنے کی آواز)

شنکر :۔ آئیے آئیے کامران صاحب! ہم لوگ آپ کا ہی انتظار کررہے تھے ـــــــ میرا نام رمیش شنکر ہے۔ اور یہ میری پتنی رادھیکا۔
رادھیکا :۔ نمستے۔
کامران :۔ نمستے۔

رادھیکا :۔ آئیے۔ آپ کو یہاں آنے میں تکلیف تو نہیں ہوئی۔

کامران :۔ تکلیف کیا ہوتی۔ ادھر سے تو میں اکثر گزرتا ہوں، فرق یہ ہے کہ پہلے سمندر کی لہروں کے اتار چڑھاؤ کو میرین ڈرائیو کی پٹڑی سے دیکھتا تھا۔ آج آپ کے فلیٹ کی بالکنی سے دور تک پھیلا ہوا سمندر نظر آرہا ہے۔

رادھیکا :۔ تو یہ منظر کیسا ہے۔

کامران :۔ یہاں سے سمندر بے بس نظر آرہا ہے، ہاتھ پاؤں مار رہا ہے مگر آپ کی اونچی بالکنی تک نہیں پہنچ سکتا۔

شنکر :۔ واہ ـــــ کیا شاعری ہے۔

رادھیکا :۔ آپ یہ کیوں نہیں محسوس کرتے کہ آپ اس وقت سمندر سے کہیں بلند ہیں۔

کامران :۔ اپنی اوقات کیسے بھول سکتا ہوں۔

شنکر :۔ یہ کیا فرما رہے ہیں آپ، آپ تو شہرت کے آسمان پر ہیں۔

کامران :۔ اور آسمان فریبِ نظر ہے۔

رادھیکا :۔ شنکر یہ شاعر ہیں۔

شنکر :۔ بیشک۔ شاعروں اور کویوں کی بات ہی نرالی ہوتی ہے۔

جہاں نہ پہنچا روی
وہاں پہنچا کوی

اس بات پر کوئی شعر ـــــ

کامران :۔ دیکھیے شنکر صاحب! میں اسی شرط پر یہاں آیا ہوں کہ شعر و شاعری نہیں ہوگی۔

رادھیکا :۔ ہاں ہاں۔ بالکل نہیں۔

(برتنوں کے رکھنے کی آواز)

لیجیے پہلے آپ گرم گرم پکوڑے کھائیے ـــــ یہ گوبھی کے۔ یہ پنیر کے۔

کامران :۔ شکریہ۔

رادھیکا :۔ احتیاط سے۔ بہت گرم ہیں۔

کامران :۔ (پکوڑا منہ میں رکھ کر بولتے ہوئے) مجھے گرما گرم کھانے کی عادت ہے۔

رادھیکا :۔ خطرناک ہو سکتی ہے۔

(دونوں ہنستے ہیں)

شانتا :۔ (فیڈان) نمستے۔

رادھیکا :۔ آئیے بھابی جی ــــ ان سے ملیے یہ ہندوستان کے مشہور شاعر کامران شیرازی ہیں۔

کامران :۔ آداب۔

رادھیکا :۔ اور یہ ہماری بھابی شانتا ہیں۔ انھیں شاعری کا بہت شوق ہے۔

کامران :۔ بہت خوب۔

(فون کی گھنٹی بجتی ہے)

شنکر :۔ ہلو ــــ جی ــــ جی ہاں۔ شما کیجیے۔ بس ــــ تھوڑی دیر میں پہنچ رہا ہوں۔

(فون رکھ کر)

معاف کیجیے۔ مجھے ایک بزنس میٹنگ میں جانا ہے۔

کامران :۔ تو میں بھی چلتا ہوں۔

رادھیکا :۔ (ہنس کر) بزنس میٹنگ میں (ہنسی)

کامران :۔ نہیں میرا مطلب تھا . . . . . .

شنکر :۔ نہیں کامران صاحب! آپ اطمینان سے چائے پیجیے۔ باتیں کیجیے۔ اصل میں میرا پہلے سے اپائنٹمنٹ تھا اس کے لیے مجھے جانا پڑ رہا ہے۔

رادھیکا :۔ کامران صاحب! آپ کو تو میں نے بلایا ہے ــــ میں تو کہیں نہیں جا رہی ہوں۔

شنکر :۔ اچھا نمستے ــــ بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔

کامران :۔ مجھے بھی۔

(جانے اور دروازہ بند کرنے کی آواز)

شانتا :۔ معاف کیجیے کامران صاحب!

کامران :۔ کیا آپ کو بھی کہیں جانا ہے۔

شانتا :۔ (بے ساختہ ہنس کر) نہیں ــــ نہیں میں تو کچھ اور کہہ رہی تھی ــــ میں دراصل میں . . . . . .

کامران :۔ دراصل میں ۔۔ نہیں ۔۔۔ دراصل ۔

شانتا :۔ آپ تو ایک اچھے استاد بن سکتے ہیں۔

کامران :۔ اب میں کہوں ۔ معاف کیجیے شانتا صاحبہ ۔

رادھیکا :۔ بھابی آپ نے ان کا کلام نہیں سنا ہے۔اس لیے آپ کو ان کی شاعری کا رنگ نہیں معلوم ۔ یہ بہت تیکھی اور چٹیلی نظمیں کہتے ہیں۔

شانتا :۔ مثلاً

رادھیکا :۔ کلام کی فرمائش نہ کرنے کا میں نے وعدہ کرلیا ہے۔

شانتا :۔ مگر میں نے تو کوئی وعدہ نہیں کیا۔

کامران :۔ آپ سے کوئی بات بھی تو نہیں ہوئی اس سلسلے میں۔

شانتا :۔ تو گویا میں دخل در معقولات کر رہی ہوں۔

کامران :۔ نہیں ۔ یہ کیا فرماتی ہیں آپ ۔۔۔ بات یہ ہے کہ میں چائے اور ناشتے کی طرح ہر وقت اور ہر جگہ کلام سنانا پسند نہیں کرتا ۔

رادھیکا :۔ اچھا چھوڑیے اس فضول بحث کو۔

شانتا :۔ میں بھی اب اجازت چاہوں گی ۔آپ سے پھر ملاقات ہوگی ۔نمستے ۔

کامران :۔ نمستے ۔

رادھیکا :۔ کامران صاحب! آپ کے کلام میں ۔ اور آپ کے لہجہ میں ایک خوشگوار تلخی ہے۔ کیوں ۔۔۔ ؟

کامران :۔ اگر ہے تو آپ ہی اس کیوں کا جواب بھی تلاش کیجیے ۔ ہوسکتا ہے یہ آپ کے احساس کی تلخی ہو۔

رادھیکا :۔ کیا مطلب ۔

کامران : میرا مطلب صاف ہے کہ آپ نے اپنے ماحول کے اعتبار سے یہ تلخی محسوس کی مگر میں نے تو کوئی کڑواہٹ اپنے کلام اور لہجہ میں کبھی نہیں گھولنا چاہی۔

رادھیکا :۔ ہوسکتا ہے آپ کا جائزہ ٹھیک ہو۔ مگر میں بالکل بہت صاف لفظوں میں یہ سمجھنا چاہتی ہوں کہ آپ اپنی نظم میں کسی بیچاری دوشیزہ کو ڈانٹ کیوں رہے تھے۔

کامران :۔ اس نظم میں ۔۔۔ میں ۔۔۔ دراصل میں نہیں، بلکہ میرے طبقے کا ایک

ایسا فرد ہے جو سرمایہ دار طبقے کی جھوٹی چمک دمک اور شان و شوکت اور تفریحی محبت کے فریب میں آجاتا ہے۔ اسی لیے میں نے کہا ہے ؎

میں حسن دوست سہی، حسن کا غلام نہیں
میں تشنہ کام سہی، اتنا تشنہ کام نہیں
کہ پُر فریب محبت کا اعتبار کروں
ترے جمال کی رعنائیوں کو پیار کروں

رادھیکا:۔ چک چک چک بیچاری جمال کی رعنائیوں والی جو آپ جیسے شاعروں کے کلام کے تیکھے پن کے جال میں آگئی۔ اور اب ڈانٹ پھٹکار کھا رہی ہے۔

کامران:۔ آپ کو اس سے بہت ہمدردی ہے۔

رادھیکا:۔ کامران بھائی! مجھے اس سے نہیں۔ آپ سے ہمدردی ہے، اسے تو آپ کی پرواہ بھی نہیں۔ آپ اسے اپنی دسترس سے دور پا کر جھلا رہے ہیں۔ اپنے احساسِ کمتری اور محرومی کا شکار ہو کر فقرہ بازی کر رہے ہیں، طنز کر رہے ہیں۔ اس طنز میں ایک تیکھا پن ہے، چٹ پٹا ذائقہ ہے آپ کی نظموں کا۔ مگر اس کے پیچھے!!____ اس کے پیچھے آپ کی____ میرا مطلب ہے اس طبقے کے فرد کی۔ روح سسک رہی ہے۔

کامران:۔ بہت اچھا تجزیہ کیا آپ نے رادھیکا بہن!۔

رادھیکا:۔ مجھے آپ صرف رادھیکا ہی کہیے۔ میں آپ سے عمر میں چھوٹی ہوں۔ اور کسی اور غلط فہمی کی بھی شکار نہیں ہوں اور نہ ہو سکتی ہوں۔

(دونوں ہنستے ہیں)

کامران:۔ آپ میری توقع سے زیادہ ذہین نکلیں۔

رادھیکا:۔ شکریہ۔

کامران:۔ کیا آپ اردو جانتی ہیں۔

رادھیکا:۔ سمجھ سکتی ہوں، پڑھ نہیں سکتی۔ یہ اُلٹی لکھائی پلّے نہیں پڑتی، ایک آدھ بار کوشش کی تھی۔

کامران:۔ اُلٹی نہیں، سیدھی لکھائی ہے____ اور آپ کہیں تو میں آپ کو سکھا سکتا

ہوں۔

کامران :۔ نیکی اور پوچھ پوچھ ـــــ میں بھنڈی بازار سے قاعدہ منگا لونگی آپ جب چاہیں پڑھا دیا کریں۔

کامران :۔ آپ کو اردو سکھانے کے لیے بازاری قاعدے کی ضرورت نہیں۔ میں آپ کو اپنے طور پر ہی پڑھا دوں گا۔ میرا خیال ہے آپ ایک ہفتے میں لکھنے لگیں گی۔

رادھیکا :۔ ایک ہفتے میں!!

کامران :۔ بالکل۔ آپ جیسی ذہین عورت کو اردو لکھنا سیکھنے کے لیے ایک ہفتہ کافی ہے۔

رادھیکا :۔ تو پھر آج سے ہی سہی۔

کامران :۔ آج سے نہیں، کل سے، آفس ٹائم کے بعد شام سے۔

رادھیکا :۔ ٹھیک ہے، اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو میں آپ کے دفتر گاڑی بھیج دیا کروں گی۔

کامران :۔ پھر تو میں آپ کی گاڑی کا پابند ہو جاؤں گا۔ دفتر کے کام میں دیر سویر بھی تو ہو جاتی ہے۔

رادھیکا :۔ اوہ کامران بھائی ـــــ پھر یہ ٹیلی فون کس مرض کی دوا ہے،

کامران :۔ (ہنس کر) اچھا اچھا ـــــ تو اب میں چلتا ہوں۔

رادھیکا :۔ اچھی بات ہے۔ آپ سے مل کر واقعی بہت خوشی ہوئی۔

کامران :۔ اب یہی الفاظ میں کہوں تو۔ ویسے آپ گاڑی کا تکلف چھوڑیے ہو سکتا ہے کسی دن موڈ نہ ہو ـــــ میں خود ہی آجایا کروں گا۔ اور روز روز تو میں آپ کے گھر تو کیا اپنے دفتر بھی نہیں آسکتا۔

(دونوں ہنستے ہیں)
(دروازہ بند کرنے کی آواز)
(موسیقی کی لہر)

رادھیکا :۔ (دھیمے سُر میں گنگنا رہی ہے)

شنکر :۔ ارے واہ۔ تم تو سچ مچ اردو لکھنے لگیں۔ کیا لکھا ہے۔

رادھیکا :۔ اپنا نام۔ آپ کا نام ـــــ اور ایک شعر۔

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میرؔ ہوئے
ان کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

شنکر :۔ بہت خوب۔

رادھیکا :۔ کامران بھائی نے پہلے مجھے الف بے تے سکھائی۔ پھر ماتراؤں کی مدد سے لکھنا سکھایا۔ اور اب تو میں فٹافٹ پڑھتی ہوں اور کھٹاکھٹ لکھتی ہوں۔ پرسوں ان کے ساتھ محمد علی روڈ گئی تھی۔ دیکھئے یہ ڈھیر ساری اردو کتابیں خرید کر لائی ہوں۔

شنکر :۔ کمال کیا تم نے ـــــــ

رادھیکا :۔ مگر کامران بھائی ہیں موڈی آدمی۔ غصہ تو بس ناک پر رکھا رہتا ہے ـــــ اور آئیں گے تو بغیر اطلاع کے آجائیں گے۔ اور نہ آنا ہوگا تو فون پر خوشامدیں کرتے رہو۔

شنکر :۔ اچھا منشی جی اب اٹھا کر رکھو یہ کاپی کتاب اور قلم۔ بابوجی کا فون آیا تھا۔ ہمیں آج شام کے پلین سے ہی لکھنؤ جانا ہے۔

رادھیکا :۔ کیوں!

شنکر :۔ یہ بابوجی سے ہی پوچھنا۔

رادھیکا :۔ میں SURPRISE دوں گی۔ ان کے سرہانے جوشؔ اور فراقؔ وغیرہ کی کتابیں رکھی رہتی ہیں ـــــ مزا آئے گا جب میں اچانک انھیں اردو پڑھ کر سناؤں گی۔

شنکر :۔ ہاں۔ مگر مزا تبھی تو آئے گا جب تم جلدی تیار ہو کر ایرپورٹ کے لیے روانہ ہو جاؤ گی۔

رادھیکا :۔ اچھا بابا ـــــ اچھا۔

(ماحول کی تبدیلی کا سنگیت)

(کال بل بجتی ہے دروازہ کھلتا ہے)

شانتا :۔ ارے آپ کامران جی۔ آیئے۔ آیئے

کامران :۔ شکریہ ـــــ نمستے۔

شانتا :۔ نمستے ـــــ ارے ادھر کہاں جا رہے ہیں آپ ۔ اِدھر بالکنی میں آجائیے ۔آج رادھیکا نہیں ہے ۔ اچانک لکھنؤ چلی گئی ۔

کامران :۔ تو بس میں بھی چلتا ہوں ۔

شانتا :۔ بغیر چائے پیئے ہی ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے ۔

کامران :۔ نہیں کوئی بات نہیں ۔

شانتا :۔ بات تو ہے ۔ رادھیکا کیا کہے گی کہ میرے پیچھے میرے ملنے والوں کی اتنی خاطر بھی نہ کی گئی کہ ایک کپ چائے ہی پلا دی جاتی ـــــ آیئے ۔

کامران :۔ اچھا ۔ آپ مجبور کرتی ہیں تو ـــــ

(قدموں کی آواز)

شانتا :۔ تشریف رکھیے ـــــ کیا لیں گے آپ ۔

کامران :۔ کچھ بھی ۔

شانتا :۔ پھر بھی ـــــ !

کامران :۔ بس گرم گرم چائے ۔

شانتا :۔ اور !

کامران :۔ اور جو آپ کا جی چاہے ۔

شانتا :۔ اچھا ـــــ میں ایک منٹ میں آئی (آواز فیڈ آؤٹ)

کامران :۔ (سمندر کی لہروں کی آواز ہلکی ہلکی) (خود کلامی) کیا خوبصورت جگہ ہے ـــــ مگر سمندر کے یہ نظارے ایسے بار ذوق لوگوں کے لیے جو ان لہروں کی زبان بھی نہیں سمجھ سکتے ۔

رات ہو کہ دن لیکن درد مسکراتا ہے
بیقرار موجوں کو کب سکون آتا ہے

شانتا :۔ (فیڈ ان) کیا شعر پڑھ رہے تھے ابھی آپ ۔

کامران :۔ یوں ہی سوچ رہا تھا ان سمندر کی لہروں کے بارے میں ـــــ ہر وقت بے قرار رہتی ہیں ۔

شانتا :۔ زحمت نہ ہو تو شعر سنا دیں ۔

کامران :۔ میں سوچ رہا تھا ——

رات ہو کہ دن لیکن درد مسکراتا ہے

بیقرار موجوں کو کب سکون آتا ہے

شانتا :۔ یہ تو آپ نے میرے دل کی بات کہی ہے۔ میں بھی سمندر کو اپنے دل کا ایک حصّہ سمجھتی ہوں کبھی کبھی —— میں یہ کاپی اس لیے لائی تھی کہ آپ کے کچھ شعر لکھوں۔ آپ اتنی فرصت میں کہاں ملتے ہیں۔

کامران :۔ آپ تو شرمندہ کرتی ہیں —— لائیے —— یہ شعر لکھ دوں۔

شانتا :۔ ہندی میں۔

کامران :۔ جی ہاں۔ ہندی مجھے آتی ہے۔

شانتا :۔ لیجیے —— (ہنس کر) ارے واہ کامران صاحب! آپ سے بس اتنی ہی ہندی آتی ہے۔

کامران :۔ کیوں کیا غلطی ہے۔

شانتا :۔ اس ह پر چھوٹی اِی کی ماترا ہونی چاہیے —— اور —— درد —— ایسے تھوڑی لکھتے ہیں۔ ایسے۔ र्द اوپر۔

کامران :۔ شکریہ۔

شانتا :۔ مجھے تھوڑی اردو بھی آتی ہے —— دیکھیے —— آپ کا نام لکھنے کی کوشش کرتی ہوں۔

کامران :۔ (بے ساختہ ہنس کر) ایسے الگ الگ نہیں، اردو میں حرف ملا دیے جاتے ہیں۔ یہی تو اس کی خوبی ہے۔

شانتا :۔ کیسے۔

کامران :۔ سیدھی سیدھی بات ہے، جہاں آ کی ماترا لگتی ہے وہاں الف لگایا جاتا ہے۔

شانتا :۔ ایک بات پوچھوں۔

کامران :۔ ضرور۔

شانتا :۔ آپ مجھے اردو پڑھا دیا کریں گے۔

کامران :۔ یہ بات آپ رادھیکا سے پوچھیے۔

شانتا :- ہوں ـــــ آپ رادھیکا کو اُردو کیسے پڑھاتے ہیں۔

کامران :- دیکھیے شانتا صاحبہ ! میں رادھیکا کو ٹیوشن نہیں پڑھاتا۔ اور نہ پڑھانا میرا پیشہ ہے۔ رادھیکا میری دوست ہے، اور میں دوستوں سے برابری سے ملتا ہوں اور برابری کے اس مرتبے کو میں کسی قیمت پر قربان نہیں کر سکتا۔ خاص طور پر امیر دوستوں سے ملتے وقت میں اس بات کا خاص خیال رکھتا ہوں۔

شانتا :- (ہلکی سی ہنسی کے ساتھ) میں نے یہ سب کچھ تو آپ سے نہیں پوچھا تھا۔ میں آرٹسٹوں کے کے مزاج کو سمجھتی ہوں۔ ان کی خودداری کو بہت جلد ٹھیس پہنچ جاتی ہے۔

(چائے کے برتن رکھنے کی آواز)

لیجیے آپ چائے پیجیے۔

کامران :- ارے آپ نے تو بہت تکلف کیا ـــــ بھلا ان گلاب جامنوں کی کیا ضرورت تھی۔

شانتا :- مجھے میٹھا زیادہ پسند ہے۔

کامران :- یہ پکوڑیاں تو بہت لذیز ہیں ـــــ (کھاتے ہوئے) سبھی چیزیں بہت مزیدار ہیں کیا نیا رسوئیا آیا ہے۔

شانتا :- نہیں وہی ہے جس کے ہاتھ کے پکوڑے وغیرہ آپ اکثر کھاتے ہیں۔

کامران :- تو پھر آپ نے خاص ہدایت کی ہوگی ـــــ اور یہ چاندی کے قلعی والی کراکری بھی لطف پیدا کر رہی ہے۔

شانتا :- چاندی کی قلعی کی نہیں ـــــ چاندی کی ہی ہے۔

کامران :- (ہنس کر) چلیے آج چاندی کے برتنوں میں بھی کھا پی لیا۔

شانتا :- آپ طنز تو نہیں کر رہے ہیں۔

کامران :- اتنی اچھی چائے اور اتنے خوبصورت ماحول پر کون طنز کر سکتا ہے۔

شانتا :- خیالِ خاطرِ احباب چاہیے ہر دم

کامران :- انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو ـــــ مگر آپ کو یہ شعر کیسے یاد ہے۔

شانتا :- کامران صاحب! شعر کسی کی جاگیر تو نہیں ہوتا۔ شوق ہے۔ جمع کرتی ہوں۔ یاد کرتی ہوں دیکھیے اس کاپی میں کتنے اچھے اچھے شعر لکھے ہیں۔ آپ بھی کچھ لکھ دیجیے ـــ اپنے ہاتھ سے۔

کامران :۔ لائیے ۔ بڑی آرزو ہے کوئی مری انجمن میں آئے
مرے سازِ بے صدا کا کوئی تار گنگنائے

شانتا :۔ آپ کی یہ غزل میں نے ریڈیو پر سنی تھی، اور کچھ شعر لکھ لیے تھے۔

کامران :۔ آپ تو کافی باذوق معلوم ہوتی ہیں۔

شانتا :۔ شکریہ ۔

کامران :۔ آج آپ سے مل کر واقعی خوشی ہوئی، اب اجازت دیجیے ۔

شانتا :۔ اچھا۔ مگر کل ضرور تشریف لائیے ۔

کامران :۔ کل ——— !

شانتا :۔ دیکھیے میں آپ کی دوست نہ سہی ——— فین تو بن سکتی ہوں۔

کامران :۔ پھر شرمندہ کیا آپ نے ——— کل ضرور آؤں گا۔

(ماحول کی تبدیلی کا سنگیت)

(کال بل بجتی ہے)

شانتا :۔ آیئے کامران صاحب ! میں آپ کا ہی انتظار کر رہی تھی۔

کامران :۔ مجھے دیر تو نہیں ہوئی۔

شانتا :۔ نہیں ——— آپ مناسب سمجھیں تو ذرا باہر کی ہوا کھالیں۔

کامران :۔ کہاں ۔

شانتا :۔ چلیے ——— کوہ نور ہوٹل چلتے ہیں۔

کامران :۔ تو آج آپ پڑھیں گی نہیں ۔

شانتا :۔ وہیں پڑھ لیں گے ۔ بڑی خوبصورت جگہ ہے ——— چلیے ——— میرا ڈرائیور نیچے انتظار کر رہا ہے۔

کامران :۔ تو گویا آپ نے پروگرام پہلے سے بنا رکھا تھا ۔

شانتا :۔ گستاخی تو نہیں کی۔

کامران :۔ نہیں ——— چلیے ۔

[موٹر کار چلنے کی آواز
رکنے کی آواز]

(شائستہ قسم کے ریسٹوران کا شور)

شانتا :۔ بیرا۔ صاحب کے لیے چکن سینڈوچ ــــ اور ہمارے لیے۔

بیرا :۔ وہ مجھے معلوم ہے۔

کامران :۔ کیا آپ یہاں اکثر آتی ہیں۔

شانتا :۔ کبھی کبھی ــــ مگر میں اپنے بھروسے کے بیرے ، بھروسے کا ڈرائیور۔ اور بھروسے کے ساتھی ہی پسند کرتی ہوں۔

کامران :۔ کیا بات ہے۔

شانتا :۔ ہاں آج میں شاپنگ کو گئی تھی ــــ یہ ٹائی پسند آ گئی۔

کامران :۔ (ہنس کر) آپ باندھیں گی۔

شانتا :۔ نہیں۔ آپ کے لیے۔

کامران :۔ خوبصورت ہے۔ مگر ٹائی باندھنے کے لیے سوٹ پہننا پڑے گا۔

شانتا :۔ تو پہنیے۔

(ماحول کی تبدیلی کا سنگیت)

(موٹر کے چلنے کی آواز۔ پس منظر میں مناسب موسیقی)

شانتا :۔ کامران صاحب! میں اپنی پسند کی ایک چیز آپ کے لیے لائی ہوں۔ انکار نہ کیجیے گا

کامران :۔ واہ۔ یہ بندش بھی خوب ہے۔

شانتا :۔ یہ سوٹ

کامران :۔ آپ کی پسند تو بہت اچھی ہے۔

شانتا :۔ شکریہ۔

کامران :۔ ہیں۔ یہ اتنے سارے روپے۔

شانتا :۔ آپ کے لیے نہیں ــــ درزی کے لیے۔

(موسیقی ابھر کر فیڈ آؤٹ ہو جاتی ہے)

(موٹر کار کے ہورن کی آواز)

شانتا :۔ معاف کیجیے۔ ذرا دیر ہو گئی ــــ اترتے اترتے کسی کا ٹیلی فون آ گیا تھا ــــ

اچھا کیا آپ نے ٹیکسی لینے آئے۔

کامران :۔ آج کل بسوں میں بہت بھیڑ ہونے لگی ہے۔

شانتا :۔ اور آپ جیسا شاعر بسوں میں بھٹکتا پھرے، مجھے اچھا نہیں لگتا۔

کامران :۔ ہاں زندگی کو زندگی کی طرح گزارنا چاہیے۔

شانتا :۔ یہ ہوئی نہ بات ـــــ اچھا آج دوپہر آپ نے اس تھرڈ کلاس ایرانی ہوٹل کو تو نہیں نوازا تھا۔

کامران :۔ نہیں بابا نہیں۔

شانتا :۔ کل آپ میرے ساتھ لنچ کریں گے۔ مگر گھر پر نہیں۔

کامران :۔ ضرور کریں گے۔ مگر اب تو چلیے ـــــ میں ڈریم لینڈ کے ٹکٹ لا یا ہوں، نئی پکچر آئی ہے۔

شانتا :۔ چلیے۔

(کار چلنے کی آواز، پس منظر میں ہلکی ہلکی موسیقی)

شانتا :۔ آج تو بہت سمارٹ لگ رہے ہیں آپ۔

کامران :۔ شکریہ۔

شانتا :۔ کوئی نئی غزل کہی ہے کیا۔

کامران :۔ نہیں، آج کل غزل وزل کا موڈ نہیں بنتا۔

شانتا :۔ اچھا دیکھئے ـــــ میں ایک ہفتے کے لیے کوڑی کنال جا رہی ہوں۔ آپ یہ رکھیے۔

کامران :۔ یہ کیا۔

شانتا :۔ بلینک چیک۔

کامران :۔ میں کیا کروں گا۔ آج کل تو میری جیب میں روپے ہی روپے ہوتے ہیں۔

شانتا :۔ (ہلکی ہنسی) شاعر صاحب! رکھ لیجیے ـــــ ضرورت پڑ سکتی ہے۔ میں آپ کے بریف کیس میں رکھ دیتی ہوں۔

کامران :۔ اچھا ـــــ اچھا بھئی۔

ارے ہاں! ایک دلچسپ بات۔

شانتا:۔ کیا۔

کامران:۔ آج رادھیکا کا فون آیا تھا۔ شام کو گھر بلایا تھا مگر میں نے ٹال دیا۔

شانتا:۔ کیوں۔

کامران:۔ آپ سے جو ملنا تھا۔

شانتا:۔ (ہنس کر) اب رادھیکا سے روز ملیے گا۔ میں تو باہر جا رہی ہوں۔

کامران:۔ کیوں۔ !مجھے دنیا میں کوئی اور کام نہیں ہے کیا۔

شانتا:۔ خیر۔ یہ آپ جانیں۔

(ماحول کی تبدیلی کا سنگیت)

(دروازے پر دستک)

کامران:۔ آئیے۔ دروازہ کھلا ہے۔

رادھیکا:۔ کامران بھائی آداب عرض۔

کامران:۔ کون رادھیکا تم ـــــ میرا مطلب ہے یہاں ـــــ اس وقت۔ کیسے۔

رادھیکا:۔ گھبرائیے مت۔ میں نہ آپ کو لنچ کی دعوت دینے آئی ہوں، نہ آپ کے اعزاز میں ڈنر کا اہتمام کر رہی ہوں، نہ پکچر دیکھنے کا ارادہ ہے۔

کامران:۔ پھر؟

رادھیکا:۔ میں تو آپ کی خیریت معلوم کرنے آئی تھی۔ پتہ چلا تھا آپ دفتر سے اکثر غائب رہتے ہیں، آپ کو کسی قسم کی ذہنی بیماری ہو گئی ہے۔

کامران:۔ یہ تم پہیلیاں کیوں بجھا رہی ہو۔ صاف صاف کہو کیا کہنا ہے۔

رادھیکا:۔ کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ آپ ٹیلی فون پر سیدھے منہ بات کیوں نہیں کرتے۔ اور آپ کی شامیں کہاں گزرتی ہیں۔

کامران:۔ (تیز لہجے میں) تمھیں کیا حق ہے مجھ سے اس طرح کے ذاتی سوال کرنے کا۔

رادھیکا:۔ حق تو نہیں ہے ـــــ مگر ـــــ

کامران:۔ مگر کیا۔

رادھیکا:۔ میں آپ کی دوست اور ہمدرد کی حیثیت سے یہ بتانا اپنا فرض سمجھتی ہوں کہ آپ

غلط راستے پر جا رہے ہیں۔

کامران :۔ کونسا غلط راستہ۔ جب میں تم سے روز شام کو ملتا تھا تو وہ راستہ بالکل صحیح تھا۔ اور اب کبھی کبھار کسی کے ساتھ کھانا کھالیا، گھوم لیے یا پکچر دیکھ لی تو تم نے سراغ رسانی کا دھندا شروع کر دیا اور مجھے غلط اور صحیح کی تمیز سکھانے آگئیں۔ سچ بات یہ ہے کہ تم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کہ تم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

رادھیکا :۔ جل گئی ہو ـــــ یہی نا !

کامران :۔ ہاں۔

رادھیکا :۔ آپ آسمان سے زمین پر منہ کے بل گرنے والے ہیں۔

کامران :۔ میں نے آسمانوں کو زمین پر اتار لیا ہے۔ تم ہو یا تمھاری بھابی ـــــ دونوں میری خوشامدیں کرتی ہو۔ یہ میری خودداری کی فتح ہے۔

رادھیکا :۔ فتح اور شکست کا فیصلہ تو وقت کرے گا۔ مگر میں آپ کو یہ کھیل زیادہ دن نہیں کھیلنے دوں گی۔

کامران :۔ کونسا کھیل۔

رادھیکا :۔ ایک شادی شدہ عورت ـــــ اور وہ بھی میری جیٹھانی سے محبت کا کھیل۔

کامران :۔ خبردار جو آگے ایک لفظ کہا تو ـــــ شانتا کے ساتھ میرا کوئی معاشقہ نہیں۔

رادھیکا :۔ پھر گھنٹوں ہوٹلوں میں بیٹھے کیا کرتے ہیں آپ دونوں۔

کامران :۔ وہ۔ وہ میری فین ہے، میرے فن کی پرستار ہے، میری کلا کی پجارن ہے۔

رادھیکا :۔ اور آپ ان کے بلینک چیک کے پجاری ہیں۔

کامران :۔ یہ۔ یہ سراسر غلط ہے۔ تم ـــــ تم جانتی ہو کہ میں پیسے کا بھوکا نہیں ہوں۔

رادھیکا :۔ نہیں تھے۔

کامران :۔ اچھا ہوں ـــــ پھر تمہیں کیا۔

رادھیکا :۔ ہم نیک و بد حضور کو سمجھائے جاتے ہیں ـــــ آداب عرض۔ میں پھر لکھنؤ جا رہی ہوں۔

کامران :۔ آداب عرض۔ تم لکھنؤ جاؤ یا کلکتہ ـــــ مجھے کیا۔

(ماحول کی تبدیلی کا سنگیت)

(گاڑی کے ہارن کی آواز ___ زور زور سے ہارن بجایا جا رہا ہے)

کامران:۔ افوہ۔ کیا ہوا آج شانتا کو ___ کوئی جواب ہی نہیں ___ پکچر کا وقت نکلا جا رہا ہے ___ اور آج ___ آج تو ریس کورس بھی جانا تھا مجھے ___ ڈرائیور۔ پھر ہارن بجاؤ۔

(ہارن بجتا ہے)

کوئی جواب نہیں ___ ڈرائیور ار لیس کورس چلو ___ آج پھر اپنی قسمت آزماؤں گا۔

(گاڑی اسٹارٹ ہوتی ہے اور پھر میوزک میں موٹر کی آواز گھل جاتی ہے۔ تیز میوزک پس منظر میں چلتا رہتا ہے)

کامران:۔ (فون کا ڈائل گھمانے کی آواز) چار۔ چار۔ آٹھ۔ آٹھ۔ سات۔ چھ۔ ہلو ___ ہلو ___ ہلو ___ ارے کوئی تو بولو ___ کون سکھ دیو۔ ارے شانتا بائی سے کہو ہم ہیں ___ اچھا ___ (فون پٹک دیتا ہے) یہ سکھ دیو کا بچہ اتنا بد تمیز ہے کہ شانتا نو نون لی خبر تک ہیں لی ___ آج اس کے کان کھینچوں گا۔

(فون کی گھنٹی بجتی ہے)

ہلو۔ کامران بول رہا ہوں۔ جی ! ارے سر ماجی! ایک ہزار روپے کی بھی کوئی اوقات ہے۔ آج شام کو ہی پہنچا دوں گا ___ اس وقت ___ جی نہیں۔ آپ کو معلوم ہے کل میں اپنے سب روپے ہار گیا تھا ورنہ مجھے پاگل کتے نے کاٹا تھا کہ آپ سے روپیہ قرض لے کر گھوڑا کھیلتا ___ اور وہ گھوڑا سو فیصدی جیتنے والا تھا۔ نہ جانے کیسے ہار گیا ___ خیر ___ آج شام کو۔

(ریسیور رکھنے کی آواز)

(ماحول کی تبدیلی کا سنگیت۔ دروازے کی گھنٹی کی آواز)

سکھدیو:۔ کون !

کامران:۔ ارے ہم۔ اور کون !!

سکھدیو:۔ آئیے ___ بیٹھیے۔

کامران:۔ ہاں ہاں بیٹھ جاؤں گا۔ تو اپنا کام کر۔

سکھدیو :- اپنا کام ہی تو کر رہا ہوں۔

کامران :- تیرا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا۔

سکھدیو :- نہیں بابو صاحب ـــــــ پانی لاؤں۔

کامران :- ہاں لے آ ـــــــ شانتا بائی اندر ہیں نا۔

سکھدیو :- ہاں ہیں ـــــــ مگر دروازہ بند ہے۔

کامران :- اور کون ہے اندر۔

(کمرہ سے خوب ہنسی کی آوازیں آرہی ہیں)

سکھدیو :- لیجیے بابو صاحب پانی پی لیجیے ـــــــ اور اطمینان سے بالکنی میں بیٹھیے۔

کامران :- ہاں بیٹھتا ہوں۔

(اندر سے قہقہوں کے ساتھ آوازیں)

شانتا :- بس آپ کی یہی باتیں تو یاد آتی ہیں۔

مرد :- اور یہ باتیں سکھائی کس نے ہیں۔ (ہنسی)

شانتا :- میں تو یہ مانتی ہوں کہ زندگی زندہ دلی کا نام ہے۔

مرد :- تم اب تک وہی کالج کی شانو ہو۔

شانتا :- اور تم ـــــــ! تم بھی تو نہیں بدلے۔

(آوازیں جاری رہتی ہیں)

کامران :- ہوں! تو یہ کوئی پرانے عاشق ہیں ـــــــ اس شانتا کی بچی کو یہ معلوم نہیں کہ میں یہاں ہوں ـــــــ رادھیکا کو تو کیا بھاڑا تھا۔ آج اس کی اچھی طرح خبر لوں گا۔

(ٹہلنے کی آواز۔ الجھن کا سنگیت)

سکھدیو :- بابو صاحب! آپ کب تک یوں ٹہلتے رہیں گے۔ آرام سے بیٹھ جائیے۔ یا پھر آجائیے گا۔

کامران :- بکواس بند کر۔ تیری یہ جرات۔ بدتمیز۔ نالائق۔

شانتا :- (دور سے آواز) سکھدیو! کس کی آواز ہے یہ۔

سکھدیو :- بائی جی! کامران صاحب آئے ہیں۔

(دروازہ کھلنے کی آواز)

شانتا :- ارے آپ کامران صاحب!

کامران :- ہاں میں۔

شانتا :- اس غریب پر کیوں غصّہ کر رہے تھے۔

کامران :- اور کیا اس کو گلے لگاؤں ___ میں نے ٹیلی فون کیا۔ اس نے آپ کو اطلاع نہیں دی۔ اب میں گھنٹہ بھر سے یہاں بیٹھا ہوں اور اس نے آپ کو خبر تک نہیں کی۔

شانتا :- کامران صاحب! سکھدیو میرا نوکر ہے، آپ کا نہیں، آپ کو اسے ڈانٹنے کا کوئی حق نہیں۔

کامران :- یہ آپ کہہ رہی ہیں۔

شانتا :- ہاں میں کہہ رہی ہوں۔ اس گھر کی مالکن ___ اور آپ بغیر اطلاع کے گھر میں آ کیسے گئے۔

کامران :- شانو جی (طنز سے) میں اس لیے نہیں آیا تھا کہ آپ کے پرانے دوست کی باتیں سنوں۔

شانتا :- آپ حد سے بڑھے جا رہے ہیں۔ اپنی حیثیت نہ بھولیے۔

کامران :- اچھا چھوڑو شانتا یہ سب باتیں۔ اتفاق سے تم سے کئی دن سے ملاقات نہ ہو سکی اس لیے میں چلا آیا۔

شانتا :- ٹھیک ہے، تو اس میں چیخنے چلانے کی کیا ضرورت تھی۔

کامران :- معاف کرنا۔ پریشانی میں آدمی اپنا توازن کھو بیٹھتا ہے۔

شانتا :- اور آپ بھی آپے سے باہر ہو گئے، اور کوئی بس نہ چلا تو نوکر پر ہی برس پڑے۔

کامران :- اب کچھ بھی سمجھو ___ میں ___ دراصل ___ مجھے ___

شانتا :- ہاں بولیے بولیے ___ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔

کامران :- اب میں اپنے منہ سے کیا کہوں۔

شانتا :- پھر بھی ___ کچھ تو کہیے شاعر صاحب! میں آپ کے منہ سے ہی تو سننا چاہتی ہوں۔

کامران :- شانتا آج تمھیں کیا ہو گیا ہے۔

شانتا :- تم نہیں۔ آپ کہیے۔

کامران :- آپ، آپ سے اب میں کیا کہوں ___ اور کیسے کہوں ___ آپ جانتی ہیں مجھے

ضرورت ہے۔

شانتا :۔ کاہے کی ضرورت ہے۔

کامران :۔ آپ خوب جانتی ہیں۔

شانتا :۔ مسٹر صاف صاف کہیے۔ پہیلیاں نہ بجھوائیے۔ جلدی بولیے۔ میرے احباب بیٹھے ہیں۔

کامران :۔ شانتا مجھے روپے کی ضرورت ہے۔

شانتا :۔ (بے ساختہ کھکھلا کر ہنستی ہے) روپیہ کی ضرورت ــــــ اور آپ کو ــــــ (پھر ہنستی ہے) اب میرے پاس آپ کے لیے ایک پیسہ بھی نہیں ہے ــــــ آپ کی اکڑ، خودداری، خودپرستی اور بے نفلی کی جو قیمت میں نے مقرر کی تھی وہ میں ادا کرچکی۔ رادھیکا بھی مات کھاچکی اور آپ بھی بے سروسامان ہوچکے۔ اب آپ اپنی لاش واپس لے جاسکتے ہیں ــــــ اس سمندر میں بہت سے جزیرے ڈوب چکے ہیں ــــــ اب آنکھیں پھاڑے میرا منہ کیا تک رہے ہیں آپ ــــــ سکھدیو! صاحب کو لفٹ تک پہنچادو ــــــ

(گمبھیر مگر چیختا ہوا سنگیت ماحول پر چھا جاتا ہے اور آہستہ آہستہ فیڈ آؤٹ ہوجاتا ہے)

●

زندگی کی طرف

(ریڈیائی ڈرامہ)

کردار:۔

- بلراج ۔ ایک ریٹائرڈ کلرک — عمر ۶۵ سال
- دمینتی ۔ بلراج کی پتنی — عمر ۶۰ سال
- کیلاش۔ بلراج کا بیٹا — عمر پچیس سال
- ڈاکٹر پٹیل۔ ایک ماہرِ نفسیات ڈاکٹر — عمر ۴۵ سال
- مس کانچ والا۔ ایک مریضہ — عمر ۳۰ سال
- ماں۔ — عمر ۳۵ سال
- اسٹیشن ماسٹر۔
- دو مسافر
- ۴ بچے۔ — عمر سات آٹھ سال

"کیلاش بابو! آپ حقیقی زندگی کو اپنائیے۔ آپ کے پتا کی عمر ساٹھ سال سے زیادہ ہے۔ اب تو وہ دنیا ہی بدل گئی جس میں انھوں نے آنکھ کھولی تھی۔ اب آپ کہاں ڈھونڈیں گے اس کنویں اور چوپال کو۔ ہوسکتا ہے اب وہ گاؤں کسی شہر کا ایک حصّہ بن چکا ہو، ہوسکتا ہے گاؤں کا وہ کنواں ٹیوب ویل میں تبدیل ہوچکا ہو، چوپال کی جگہ کوئی دفتر بن گیا ہو ——— بیتے ہوئے دن صرف یاد کرنے کے لیے ہوتے ہیں۔"

(اس ڈرامے کا ایک اقتباس)

زندگی کی طرف

(TITLE MUSIC کے طور پر ایسا آرکیسٹرا فیڈ ان ہوتا ہے جو ذہنی خلفشار کو ظاہر کرتا ہے، ذہنی الجھنوں کو ظاہر کرتی ہوئی لہریں آرکیسٹرا پر بلند ہوتی ہیں ـــــ پھر آہستہ آہستہ ذہنی سکون کی کیفیت آرکیسٹرا سے ظاہر ہوتی ہے اور فیڈ آؤٹ ہو جاتا ہے)

بلراج :- (فیڈ ان) میں کہتا ہوں کیا ہو گا ـــــ اب اس دنیا میں چونی بھر بھی مروت نہیں رہی۔ (بلند آواز سے) ارے کہاں ہو سشما کی ماں!!

دمینتی (آواز دور سے نزدیک آتی جاتی ہے) میں یہاں ہوں رسوئی میں ـــــ تم اب تک چونی اٹھنی کی بات کرتے ہو۔ دنیا ترقی کر رہی ہے۔ تمہارے زمانے میں روپے میں ۶۴ پیسے ہوتے تھے، اب پورے سو ہوتے ہیں۔

بلراج :- بیشک۔ تم سولہ آنے سچ کہتی ہو۔

دمینتی :- مگر تم گئے تھے کہاں ـــــ! ڈاکٹر نے کہا ہے کہ ان کو کہیں اکیلے نہ بھیجا کرو ـــــ اور تم ہو کہ ....

بلراج :- ارے وہیں گیا تھا اپنے بڑے بابو کے دفتر۔

دمینتی :- تو کیا ہوا۔

بلراج :۔ ہونا کیا تھا ـــــ میں نے اپنے نام کی چٹ بھجوائی تو چپراسی سے کہلا دیا کہ ابھی مصروف ہیں ـــــ کیا کام ہے اس چٹ پر لکھ دیجیے ۔

دمینتی :۔ پھر ـــــ !

بلراج :۔ میں نے لکھ دیا ـــــ وقت کاٹنے آیا تھا۔

دمینتی :۔ تمہاری تو مت ماری گئی ہے ـــــ ارے میں کہتی ہوں ایک تم بیکار ہو تو کیا ساری دنیا بیکار ہے ۔

بلراج :۔ مانا ـــــ مگر مروت بھی تو کوئی چیز ہے ۔ آخر میں نے اسے نوکر رکھایا تھا ـــــ اب بڑا بابو ہے تو کیا ہوا۔

دمینتی :۔ اسے معلوم ہے کہ تم غیر ضروری باتیں کرنے آتے ہو ـــــ اور ہو سکتا ہے وہ کسی میٹنگ میں ہو یا اور کسی اور ضروری کام میں مصروف ہو ۔

بلراج :۔ کتنا ہی ضروری کام ہو۔ ایک منٹ کے لیے مجھے بلا سکتا تھا، یا خود باہر آسکتا تھا ـــــ پرانے لوگ کہہ گئے ہیں کہ "دل بدست آور کہ حج اکبر است"

دمینتی :۔ سمجھ گئی سمجھ گئی ـــــ تمہارا مطلب ہے کہ دل رکھنا مَن کا کام ہے ۔

بلراج :۔ (ایک دم خوش ہو کر) ہاں۔ ابھی تم میں چونی بھر عقل ہے سنتھا کی ماں ـــــ نہیں اٹھنی بھر ـــــ نہیں نہیں بارہ آنے ۔

دمینتی :۔ مجھے ڈر ہے تم سولہ آنے پاگل نہ ہو جاؤ۔

بلراج :۔ کیا کہا ـــــ ! میں پاگل ہوں ـــــ !! اگر میں پاگل ہوں تو پھر تم کون ہو۔

دمینتی :۔ ہاں میں بھی پاگل ہوں۔ مگر چونی بھر۔

بلراج :۔ بہت خوب ۔ بہت خوب ـــــ اب آئے گا مزا۔ ع

"خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو"

تم بھی پاگل ۔ اور تمہاری محبت میں میں بھی پاگل ـــــ (آواز بہکنے لگتی ہے)

یہ دنیا پاگل خانہ
میں سچ کا ہوں دیوانہ
تم شمع میں پروانہ

یہ دنیا پاگل خانہ۔ یہ دنیا پاگل خانہ ۔

دمینتی :۔ اچھا اب یہ دوا پی لو۔

بلراج :۔ دوا —— ! (ہنس کر) دوا بیماروں کو پلائی جاتی ہے۔ کوئی میں پاگل ہوں جو بھلا چنگا ہو کر دوا پیوں۔

دمینتی :۔ لو، دوا میں پیئے لیتی ہوں۔ آج میرے سر میں صبح سے درد ہے۔ اور تم —— تم یہ بادام کا شربت پیو۔

بلراج :۔ بادام —— ! واہ، بادام بھی کیا چیز ہے —— "مورچہ مخمل میں دیکھا آدمی بادام میں" —— بتاؤ یہ پہیلی۔

دمینتی :۔ آنکھیں۔

بلراج :۔ بالکل صحیح، تم نے کیسے کہا تھا کہ تم چونی بھر پاگل ہو۔ اتنی مشکل پہیلی بالکل ٹھیک بتلادی۔ تم کیسے پاگل ہو سکتی ہو —— ہاں، میں تمھارا پاگل ہوں۔ مدت سے۔

دمینتی :۔ اچھا لو، بادام کا شربت۔

بلراج :۔ (شربت پینے کی آواز) کتنا مزیدار ہے۔ واہ۔

(پس منظر سے موسیقی ابھرتی ہے۔ دھیمے سروں میں۔ جو اس وقت کی کیفیت کو اجاگر کرتی ہے)۔ یہ شربت —— زیادہ میٹھا ہے —— شاید زیادہ ہی میٹھا ہے —— مجھے سرور آگیا —— تم بھی پیو۔ آج تو میں تمھیں ضرور پلاؤں گا —— تم نے میرے ساتھ کبھی نہیں پی —— ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں —— تو نے —— پی ہی نہیں —— تو —— نے —— پی —— ہی نہیں —— پی ہی۔ نہیں۔ نہیں —— نہ —— ہیں . . .

(بلراج خرّاٹے لینے لگتا ہے)

(پس منظر کی موسیقی ابھر کر فیڈ آؤٹ ہو جاتی ہے)

دمینتی :۔ سو گئے ؟ —— سو گئے —— ہائے کس بے دردی سے دوا پلا کر انھیں سلانا پڑتا ہے —— نہ معلوم کیا ہے اس دوا میں۔ جیسے —— جیسے ان کے ہوش وحواس پر برف سی جم جاتی ہے —— تمام اضطراب —— تمام بے چینی —— تمام تڑپ ختم ہو جاتی ہے —— مگر پھر —— وہی اضطراب —— وہی بے چینی —— یہ تو کوئی علاج نہ ہوا —— یہ تو حقیقت کو جھٹلانے کا ایک انداز ہوا ——

(گھبرا سانس لیتی ہے)

کیلاش :۔ (فیڈ ان) ماتا جی! کیا حال ہے آج پتا جی کا۔

دمینتی :۔ وہی حال ہے۔ باہر سے آئے تو موڈ خراب تھا۔ میں نے ابھی ابھی دوا دی ہے تو سو گئے ہیں۔

کیلاش :۔ آج پھر میرے دفتر آئے تھے۔

دمینتی :۔ ہاں وہیں سے پریشان حال آئے کہ بڑے بابو نے مجھ سے بات نہیں کی۔ پہلے بھی اکھڑے اکھڑے رہتے تھے، مگر جب سے سائیکل سے گرے ہیں، نہ معلوم سر میں کیسی چوٹ آئی کہ اور اوٹ پٹانگ باتیں کرنے لگے۔ ایسا لگتا ہے کہ ان کے دماغ کے بھنڈار میں سب کچھ الٹ پلٹ ہو گیا۔

کیلاش :۔ آپ بھی کیسی باتیں کر رہی ہیں۔

دمینتی :۔ کیا کروں ۔۔۔ بیٹیا اب مجھ سے ان کی یہ حالت نہیں دیکھی جاتی۔ اچھی خاصی باتیں کرتے کرتے ایک دم بہک جاتے ہیں۔

کیلاش :۔ اور میرے دکھ کا تو اندازہ کیجیے کہ وہ مجھے نہیں پہچانتے ۔۔۔ بس بڑا بابو کہتے ہیں، اور ایک اجنبی کی طرح بات کرتے ہیں اور باتیں کرتے کرتے ایک دم غصہ ہو جاتے ہیں۔

دمینتی :۔ لیکن بیٹیا! تم بڑے بابو بن کر ہی دو چار منٹ ان سے بات کر لیتے۔

کیلاش :۔ کیسے کر لیتا ۔۔۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ کب بھڑک جائیں اور کیا کہہ بیٹھیں ۔۔۔ اور اس وقت میرے کچھ سینیئر افسر کمرے میں موجود تھے۔ سب جانتے ہیں کہ یہ میرے پتا ہیں۔ پر وہ یوں دیکھنے میں پاگل کب لگتے ہیں۔ جاننے والے یہ نہ کہیں گے کہ ایک باپ اپنے بیٹے سے کس طرح بات کر رہا ہے۔

:۔ بس تمھارے بات نہ کرنے کا انھیں افسوس ہوا اور گھر آتے ہی بھڑک گئے۔

کیلاش :۔ جانے ان کے جی میں کیا گانٹھ ہے۔

دمینتی :۔ بیٹیا! میں ڈاکٹر کرونیش کے علاج سے مطمئن نہیں ہوں۔ وہ کہتے ہیں کہ میں مریض کی نیچر بدل رہا ہوں۔ اور ہوتا یہ ہے کہ وہ دوا کھا کر ایک دم سُن ہو جاتے ہیں ۔۔۔ بے سُدھ۔ لیکن جب اپنی اصلی حالت میں آتے ہیں تو پھر وہی بہکا بہکا انداز ہوتا ہے۔

کیلاش :۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس دوا کے استعمال کے بعد وہ مجھے اور بھی زیادہ غیر

سمجھنے لگے ہیں اور یہ میرے لیے بڑے دکھ کی بات ہے۔

دمینتی :۔ پھر کیا کیا جائے۔

کیلاش :۔ میرا خیال ہے آپ ان کو بمبئی لے جائیں۔ وہاں اچھے PSY-CHETRIC ہیں۔ شاید ان کے علاج سے ان کے ذہن کی گرہیں کھل جائیں۔

دمینتی :۔ لیکن بیٹا! میں اکیلی ان کو علاج کے لیے بمبئی کیسے لے جاؤں۔ وہاں ان کی حالت اور بگڑ گئی تو؟

کیلاش :۔ آپ بے فکر رہیں۔ میں سب بندوبست کر دوں گا۔ میرے کئی دوست ہیں وہاں۔

دمینتی :۔ تم خود کیوں نہیں چلتے میرے ساتھ۔

کیلاش :۔ ڈاکٹر کرونیش کا خیال ہے کہ ان کا مجھ سے دور رہنا مناسب ہے، اس سے ان کے علاج میں مدد ملے گی۔

دمینتی :۔ تو بیٹا! آخر تم نے کیا زہر کھول کر پلایا ہے انھیں۔

کیلاش :۔ یہ میں بھی نہیں جانتا ــــــ آپ میرے دکھ کا اندازہ کیجیے کہ میں اپنے پتا کے سامنے ہونے کے باوجود انھیں پتاجی کہہ کر نہیں پکار سکتا۔ اور وہ مجھے بیٹا نہیں سمجھتے ــــــ بڑا بابو کہہ کر میرے دل میں نشتر چبھوتے ہیں۔ اور کبھی کبھی مارنے کو بھی دوڑتے ہیں۔

دمینتی :۔ (دلاسا دیتے ہوئے) بس تو اپنا جی میلا نہ کر۔ جانے بھگوان نے ہمارے بھاگیہ میں کیا لکھا ہے ــــــ اچھا تو کھانا تو کھالے۔

کیلاش :۔ اچھا۔

(ماحول کی تبدیلی کا سنگیت)

بلراج :۔ (دور سے آواز آتی ہے) کہاں گئیں ــــــ کہاں گئیں سشما کی ماں۔

دمینتی : (دور سے) آئی ــــــ (فیڈ ان) تم سو گئے تھے کیا۔ میں رسوئی میں تھی۔ بس تمھارے لیے کھانا پروستی ہوں۔

بلراج :۔ بیٹھ جاؤ ــــــ مجھے بھوک نہیں ہے آج۔

دمینتی :۔ (ہنس کر) چونی بھر بھی نہیں۔

بلراج :۔ (خوشی سے) ارے واہ سشما کی ماں! تم بھی میری بھاشا بولنے لگیں۔

دمینتی :۔ کیوں نہ بولوں گی۔ ! سولہ آنے بولوں گی۔

بلراج :۔ اس کا مطلب ہے تم روپے میں بارہ آنے ٹھیک ہو گئیں۔

دمینتی :۔ تو تم کھاؤ ـــــ میں بھی تمھارے ساتھ کھاؤں گی ـــــ پھر ہم دونوں سولہ آنے ٹھیک ہو جائیں گے۔

بلراج :۔ ہم دونوں ـــــ ! کیا مطلب !! تم سمجھتی ہو میں بیمار ہوں۔ یہ سمجھنا ہی تو تمھاری بیماری ہے اور یہ سوچ سوچ کر تم آدھی پاگل ہو گئی ہو۔

دمینتی :۔ اور مجھے پاگل سمجھ کر تم بھی پاگلوں میں جان ڈالنے لگے ہو۔

بلراج :۔ تو تمھارا خیال ہے کہ ہم دونوں اٹھنی اٹھنی بھر پاگل ہیں۔

دمینتی :۔ (تیزی سے) ارے کوئی پاگل واگل نہیں ہے۔

بلراج :۔ یہ ہوئی نا بات۔

دمینتی :۔ تو اسی بات پر اٹھو ـــــ منہ ہاتھ دھوؤ۔ اور کھانا کھانے رسوئی میں آجاؤ۔

بلراج :۔ بس تم چلو۔ میں آیا۔

(ماحول کی تبدیلی کا سنگیت جو بازار کے شور میں ڈوب جاتا ہے، اس شور میں ٹریفک کی آوازیں اور لوکل ٹرینوں کے آنے جانے کی آوازیں شامل ہو جاتی ہیں)

(اس شور میں سے ابھرتی ہوئی ایک موٹر کار کے چلنے کی آواز ـــــ اور پھر اس موٹر کے رکنے کی آواز)

ٹیکسی ڈرائیور :۔ یہی ہے چرنی روڈ ـــــ اور وہ رہا پٹیل مینشن۔

(ٹیکسی کا دروازہ کھلنے کی آواز ـــــ ٹیکسی کا راسٹارٹ ہو کر جانے کی آواز۔ دو آدمیوں کے سیڑھی پر چڑھنے کی آواز)

بلراج :۔ یہی ہے پہلی منزل ـــــ اور یہ رہا ڈاکٹر پٹیل کا کلنک

(کال بیل بجنے کی آواز)

ڈاکٹر پٹیل :۔ (آواز دور سے) آجائیے۔

بلراج اور دمینتی :۔ نمستے ڈاکٹر صاحب۔

ڈاکٹر :۔ نمستے نمستے۔

بلراج :۔ ہم لوگ دلّی سے آئے ہیں۔

ڈاکٹر :۔ ارے آئیے آئیے ـــــ میں تو آپ کا ہی انتظار کر رہا تھا۔ ڈاکٹر کھانڈیکر نے آپ کے

بارے میں سب کچھ بتلا دیا ہے۔

بلراج :۔ کیا بتلا دیا ہے۔

ڈاکٹر :۔ یہی کہ آپ اور آپ کی پتنی دلی سے آئے ہیں مجھ سے ملنے۔ ارے آپ کھڑے کیوں ہیں۔ آرام سے بیٹھیے۔

(کرسی کھینچنے کی آواز)

ڈاکٹر :۔ ہاں تو کہیے بلراج صاحب آپ کو کیا شکایت ہے۔

دمینتی :۔ ڈاکٹر صاحب بات یہ ہے کہ......

بلراج :۔ ارے سشما کی ماں وہ مجھ سے پوچھ رہے ہیں ـــــ ڈاکٹر صاحب (ہنس کر) مجھے شکایت آپ سے نہیں، دنیا سے ہے ـــــ اور کیا پتہ آپ سے بھی کوئی شکایت ہو جائے آگے چل کر ـــــ ابھی تو آپ سے ملاقات ہی ہوئی ہے۔ اور شکایت کے لیے ملنا جلنا ضروری ہے۔ پہلے محبت ہوتی ہے، پھر شکایت پیدا ہوتی ہے۔

ڈاکٹر :۔ بہت صحیح بات کہی آپ نے۔

دمینتی :۔ (دھیمی آواز میں) اپنی بیماری کے بارے میں تو بتاؤ۔

بلراج :۔ ڈاکٹر صاحب! میری پتنی کو یہ بیماری ہے کہ وہ مجھے بیمار سمجھتی ہیں، اور آج آپ کے سامنے بتاتا ہوں کہ یہ مجھے بیماری نہیں، پاگل سمجھتی ہیں۔ مجھے تو ڈر ہے کہ اگر ان کی یہ بیماری ٹھیک نہ ہوئی تو کیا پتہ سازش کر کے مجھے پاگل خانے بھجوا دیں۔

ڈاکٹر :۔ یہ تو بڑی غلط بات ہے مسز بلراج۔

دمینتی :۔ ڈاکٹر صاحب! میں آپ سے یہ کہنا چاہتی ہوں......

ڈاکٹر :۔ مسز بلراج۔ میں سمجھ گیا ہوں کہ کون بیمار ہے ـــــ آپ یہ سب مجھ پر چھوڑ دیجیے۔

بلراج :۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ یہ سمجھ گئے کہ سشما کی ماں کو علاج کی ضرورت ہے،

ڈاکٹر :۔ (ہنستا ہے) بلراج صاحب آپ بمبئی میں کب تک ہیں۔

بلراج :۔ یہی کوئی مہینہ بھر ـــــ مگر ڈاکٹر صاحب! کیا شہر ہے۔ گھر سے نکلو تو دم گھٹا جاتا ہے۔ آدمی آدمی کو نہیں پہچانتا جس کو دیکھو بھاگا جا رہا ہے جیسے انقلاب آ گیا ہو ـــــ میں تو پچھتا رہا ہوں کہ یہاں آیا ہی کیوں۔

ڈاکٹر :۔ آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ آپ کافی تجربہ کار انسان ہیں اور آپ سے بہت کچھ

سیکھا جا سکتا ہے۔

بلراج :۔ شکریہ۔

ڈاکٹر :۔ میں چاہوں گا کہ جب تک آپ بمبئی میں ہیں۔ تیسرے دن اِدھر آجایا کریں۔ آپ سے گپ شپ کر کے لطف آئے گا۔ میں تو اس بات کا قائل ہوں کہ بزرگوں کی صحبت ہزار کتابوں کی ورق گردانی سے بہتر ہے۔

بلراج :۔ (شوخ ہنسی کے ساتھ) یہ بات آپ سنتما کی ماں کو بھی سمجھائیے۔

ڈاکٹر :۔ ضرور ——— اور آپ اجازت دیں تو میں ان سے بھی دو چار باتیں کر لوں۔

بلراج :۔ ضرور ——— مگر ڈاکٹر صاحب! میری پتنی کو سولہ آنے ٹھیک کر دیجیے گا۔

ڈاکٹر :۔ (ہنس کر) ان کو بھی اور آپ کو بھی۔

(دونوں ہنستے ہیں)

مسز بلراج! آپ ذرا اِدھر تشریف لائیں۔

(قدموں کی آواز، دروازہ کھلنے اور بند کرنے کی آواز)

دمینتی :۔ کہیے ڈاکٹر صاحب کیا خیال ہے۔

ڈاکٹر :۔ آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ نفسیاتی مریض ہیں اور کوئی خطرناک قسم کا کیس نہیں ہے، یعنی آپ ان کو پاگل نہ سمجھیں، اور نہ ان کے سامنے یہ لفظ کہیں۔ ایسے مریضوں کو پاگلوں کے ساتھ رکھنے سے ان کے مرض میں اضافہ ہوتا ہے ——— ان کا علاج تو باتوں باتوں میں کیا جائے گا۔ یہی ہمارا طریقۂ کار ہے، کسی دوا کی ضرورت نہیں۔ بس آپ ان کو ہر تیسرے دن گیارہ بجے لے آیا کیجیے گا میرے کلینک پر۔

دمینتی :۔ بہت اچھا۔

ڈاکٹر :۔ ایک بات اور ——— ہمارے علاج کے دوران کبھی کبھی مریض وقتی طور پر چڑچڑا ہو جاتا ہے کیونکہ ہم اس کے دکھی دل کو چھیڑتے ہیں۔ پرانی باتیں یاد کرواتے ہیں ——— اس لیے آپ گھبرائیے گا نہیں۔

دمینتی :۔ ڈاکٹر صاحب! میں تو ان کو چھ مہینے سے اسی حالت میں دیکھ رہی ہوں اور زبان سے ایک لفظ نہیں کہتی۔ یہ اپنے بیٹے کو نہیں پہچانتے۔ اسے بڑا بابو کہہ کر اس کے آگے ہاتھ جوڑنے لگتے ہیں۔ اور پھر ان کا دماغ اچل بچل ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی تشدد پر

آمادہ ہو جاتے ہیں۔

ڈاکٹر:۔ میں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا کہ ان سب باتوں کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ مگر آپ اطمینان رکھیں میں اپنے تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ یہ نارمل ہو جائیں گے۔

دمینتی :۔ اس امید پر تو ہم دلّی سے چل کر آپ کے پاس آئے ہیں۔

ڈاکٹر:۔ اچھا اور کوئی خاص بات ___ کوئی خاص عادت ان کی ......

دمینتی :۔ ویسے خاص تو کچھ نہیں ___ ہاں ریل کے سفر سے گھبراتے ہیں۔

ڈاکٹر :۔ کب سے۔

دمینتی :۔ شروع سے ہی۔

ڈاکٹر :۔ اور کوئی بات!

دمینتی :۔ (ہنس کر) ہنسی بھی آتی ہے ___ انھیں پرانے زمانے کا چونیاں جمع کرنے کا شوق ہے۔ کبھی کبھی تو یہ چونیوں سے بچوں کی طرح کھیلتے ہیں ___ کھیلتے رہتے ہیں اکیلے بیٹھے بیٹھے۔

ڈاکٹر :۔ (ہلکی سی ہنسی کے ساتھ) آپ سے تو نہیں لڑتے جھگڑتے،

دمینتی :۔ (ہنس کر) لڑیں گے کیوں نہیں ___ آخر ہم دونوں پتی پتنی ہیں۔

(دونوں کی ہنسی)

ڈاکٹر :۔ اچھا تو میں پرسوں ملوں گا ان سے۔

(ماحول کی تبدیلی کا سنگیت)

مس کانچ والا:۔ ہم برابر بولتا ڈاکٹر صاحب ___ پہلے وہ ہم کو LOVE جتایا ___ خالی پیلی محبت کا ڈائیلاگ بولا ___ پھوکٹ میں ہم اس کی باتوں میں آگیا ___ (رونے لگتی ہے) ہم اس کو اپنا اکھا پگار دے دیتا تھا ___

ڈاکٹر پٹیل :۔ کیوں؟

مس کانچ والا:۔ وہ بولا ___ ہم روپیہ جمع کر کے کھولی لیں گا۔ پھر ہم سے شادی بنائیں گا ___ (پھر روتی ہے) اور وہ ہمارا روپیہ اپنی گرل فرینڈ پر خرچ کرتا تھا ___ ہم کو جب اس لفڑے کا پتہ لگا۔ تو ہم سچ بولتا ہے ___ ہم نے ایک دن دونوں کی چپل سے پٹائی کیا ___ سر میں بہت درد ہے ڈاکٹر صاحب۔

(دروازہ پر دستک کی اواز)

ڈاکٹر:۔ مس کا پنچ والا۔ اب تم اٹھو ——— کچھ جی ہلکا ہوا۔

مس کا پنچ والا: تھوڑا ہوا۔

ڈاکٹر:۔ اب تم پرسوں آنا ——— گیارہ بج گئے۔ ہم نے دوسرے PATIENT کو ٹائم دیا ہے۔

(دروازہ پر دستک)

(کرسی کھسکنے، دروازہ کھل کر بند ہونے، اور پھر دروازہ کھلنے اور قدموں کی آواز)

بلراج:۔ نمستے ڈاکٹر صاحب ——— دیکھیے میں ٹھیک گیارہ بجے آگیا۔

ڈاکٹر:۔ بالکل ——— اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ DISCIPLINE کو پسند کرتے ہیں ——— اب آرام سے اس کرسی پر لیٹ جائیے اور پاؤں اس اسٹول پر رکھ لیجیے۔

بلراج:۔ کیوں صاحب! کس خوشی میں ——— آپ کی مریض باہر کھڑی ہیں۔ ان کو اندر بھیجتا ہوں۔

ڈاکٹر:۔ ان کا تو باقاعدہ علاج کیا جائے گا ——— آپ سے تو صرف باتیں کرنی ہیں اِدھر اُدھر کی۔

بلراج:۔ تو کیجیے۔

ڈاکٹر:۔ آپ تو کچھ تناؤ محسوس کر رہے ہیں نا؟

بلراج:۔ جی ہاں۔

ڈاکٹر:۔ اس لیے تو کہہ رہا ہوں کہ آپ اس کرسی پر لیٹ کر RELAX کیجیے ——— اپنے آپ کو بالکل ڈھیلا چھوڑ دیجیے ——— دماغ پر بھی زور نہ ڈالیے ———

(پس منظر سے دھیمے سروں میں ستار کی سکون ریز لہریں ابھرتی ہیں اور مکالموں کی روح کو ابھارنے کے علاوہ خاموشی کے لمحات کو بھی بھرتی ہیں)

ڈاکٹر:۔ اب جو کچھ ذہن میں ہے بولیے۔

بلراج:۔ ذہن میں تو بہت سی اوٹ پٹانگ باتیں آتی ہیں ——— مگر وہ باتیں آپ کیوں سننا چاہتے ہیں۔

ڈاکٹر:۔ تاکہ آپ کا جی ہلکا ہو جائے ـــــ ابھی آپ پوری طرح RELAX نہیں ہوتے ـــــ اپنے آپ کو ہلکا چھوڑ دیجیے ـــــ اور بولیے جو کچھ آپ کے ذہن میں آئے ـــــ کچھ بھی ـــــ ایک لفظ ـــــ دو لفظ ـــــ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کی باتیں میرے سینے میں راز کی طرح محفوظ رہے گی ـــــ بولیے۔

بلراج:۔ گدھا ـــــ بدتمیز ـــــ مجھ سے کہتا ہے پانی لاؤ ـــــ ہماری بلّی ہمیں ہی میاؤں۔ ـــــ اتر کرسی سے ـــــ ماروں گا جھانپڑ ـــــ بڑا بابو ـــــ !! اکڑتا ہے ہمارے صاحب کی کرسی پر بیٹھ کر ـــــ چار آدمیوں کے سامنے اپنی اوقات بھول گیا ـــــ مکندی لال ـــــ گھنٹی نہیں سن رہا ہے ـــــ ابے اونگھ رہا ہے یا ڈیوٹی دے رہا ہے ـــــ سر ـــــ وہ فائل تو میں نے اپنے ہاتھ سے گردھاری بابو کو دیا تھا ـــــ جی۔ میں کیسے ڈھونڈوں اس فائل کو۔ یہ ڈھیر ـــــ اندھیرا ـــــ بہت اندھیرا ـــــ یہاں تو ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا ـــــ دھول ـــــ گرد ـــــ غبار ـــــ یہ اندھیرا ہے۔ یا میری آنکھیں ہی جواب دے رہی ہیں۔

(پس منظر کی موسیقی ابھر کر فیڈ آؤٹ ہو جاتی ہے)

ڈاکٹر:۔ مسٹر بلراج۔

بلراج:۔ (ہڑبڑا کر) ارے ڈاکٹر صاحب معاف کیجیے۔ میں جانے کیا کیا کہہ رہا تھا۔ آپ بور تو نہیں ہو گئے۔

ڈاکٹر:۔ کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ۔ بھلا میں کیوں بور ہونے لگا۔ اب آپ کیسا محسوس کر رہے ہیں۔

بلراج:۔ کچھ طبیعت ہلکی نظر آ رہی ہے۔

ڈاکٹر:۔ (ہنس کر) آپ نہ جانے کس پر اپنا غصّہ اتار رہے تھے۔

(دونوں ہنستے ہیں)

اچھا اب آپ پرسوں اسی وقت تشریف لائیے گا۔

(وقت گزرنے کا تاثر سنگیت کے ذریعہ پیش کیا جاتا ہے)

(دروازے پر دستک)

ڈاکٹر :۔ آیئے بلراج صاحب! میں آپ کا ہی منتظر تھا۔

بلراج :۔ اب تو آپ کے پاس آتے ہوئے کئی دن ہو گئے ـــــ اب میں آپ سے کچھ قربت محسوس کرنے لگا ہوں۔

ڈاکٹر :۔ شکریہ ـــــ آیئے کرسی پر لیٹ جایئے RELAX

بلراج :۔ ڈاکٹر صاحب! آج سر میں ہلکا ہلکا درد ہے۔

ڈاکٹر :۔ ٹھیک ہو جائے گا ـــــ آرام سے لیٹیے ـــــ ذہن کو آزاد چھوڑ دیجیے اور جو کچھ دل میں آتا ہے اسے بیان کر دیجیے۔

(پس منظر سے مناسب موسیقی ابھرتی ہے)

بلراج :۔ یہ گاؤں کا اسکول ـــــ بڑے شرارتی ہیں سب لڑکے۔

(موسیقی کی ایک لہر ابھر کر پھر پس منظر میں چلی جاتی ہے۔ فلیش بیک۔ بچوں کے کھیل کا شور بلند ہوتا ہے)

ایک بچہ :۔ ابے بڑا اترا رہا ہے ڈاکیہ والے۔

دوسرا بچہ :۔ زبان سنبھال کر بات کر۔ جانتا نہیں میرا دوست بندو ہے، عیدو پہلوان کا بیٹا۔

تیسرا بچہ :۔ (ہنس کر) ابے تو خود کیا ہے۔

دوسرا بچہ :۔ تو جانتا نہیں میں کون ہوں ـــــ

تیسرا بچہ :۔ جانتا ہوں ـــــ بندو کا چمچہ۔

چوتھا بچہ بندو :۔ (بھاری آواز) کیا ہے بے ـــــ زیادہ بولے گا تو خون چٹا دوں گا ـــــ ڈھونڈتے پھریں گے اسٹیشن ماسٹر صاحب کہ کہاں گیا میرا لاڈلا۔

ایک بچہ :۔ اسے کیوں رعب دکھا رہا ہے ـــــ ادھر لڑ اپنے باپ سے۔

بندو :۔ تیری تو ـــــ بول۔

ایک بچہ :۔ ارے جا۔

(آپس میں گتھم گتھا ہونے کی آواز ـــــ بچوں کا سانس پھولنے اور گھونسہ بازی سے ہانپنے کی آواز۔ شاباش شاباش کہنے کی بھی آوازیں)

دوسرا بچہ :۔ واہ بھئی واہ ـــــ آج تو بلّو نے عیدو پہلوان کے پٹھے کو پچھاڑ دیا۔

بندو :۔ اس پچھاڑ کا مزہ چکھاؤں گا اسکول سے باہر۔

(بچوں کے غل غپاڑے کی آوازیں ابھر کر فیڈ آؤٹ)

بلراج :۔ یہ اسکول ــــــ یہ اکھاڑے بازی ــــــ پتا جی ــــــ میں یہاں نہیں پڑھوں گا۔

ڈاکٹر :۔ آپ نے کب چھوڑا یہ اسکول۔ (تعجب انگیز موسیقی کی لہر)

بلراج :۔ آپ کو کیسے پتہ ڈاکٹر صاحب کہ یہ میرا اسکول تھا،

ڈاکٹر :۔ میں نے تو یونہی کہا ــــــ آپ بولیے جو کچھ آپ کے ذہن میں آئے۔

(پھر پس منظر کی موسیقی ابھرتی ہے)

بلراج :۔ یہ سائیکل ــــــ ہوسٹل کے باہر کی دنیا ہی کچھ اور ہے ــــــ جس کو دیکھو اپنی دھن میں بھاگا جارہا ہے ــــــ وارڈنر ــــــ بڑا لالچی ہے ــــــ قانون ــــــ پابندی، توڑ دو ــــــ یہ دروازے توڑ دو ــــــ یہ تو کچی جیل ہے۔ آدمی خود قانون بناتا ہے اور خود ہی اس کا غلام ــــــ (ہنستا ہے) ڈنڈے کے زور سے حیوان انسان بن سکتا ہے ــــــ نہیں ــــــ نہیں (آواز کچھ اونچی ہو جاتی ہے)

(میوزک ابھر کر فیڈ آؤٹ)

ڈاکٹر :۔ مگر آپ تو اسکول میں رہ کر انسان بن گئے ــــــ اور کچھ بن کر نکلے

بلراج :۔ کیا خاک بنا ــــــ بس لوٹ پوٹ کر ایک کلرک ــــــ رشوت دینا بھی نہ آئی کہ کوئی اور سیڑھی چڑھ سکتا۔

ڈاکٹر :۔ اچھا ہوا۔

بلراج :۔ ارے میں نے آپ کو یہ سب نجی باتیں بتا دیں، آپ کسی سے کہیے گا نہیں۔

ڈاکٹر :۔ مجھے تو آپ نے کوئی خاص بات نہیں بتائی ــــــ مگر ہمارے پیشہ میں یہ اصول ہے کہ اس کمرے کی بات راز ہی رہتی ہے۔

بلراج :۔ نہیں ــــــ آپ دنیا سے کہہ دیں کہ میں خوشامد نہ کر سکا، جھوٹ نہ بول سکا۔ اس لیے کلرک بھرتی ہوا تھا اور کلرک ہی ریٹائر ہوا ــــــ اور ــــــ اور ــــــ

ڈاکٹر :۔ اور ــــــ؟

بلراج :۔ اور کچھ نہیں ــــــ آپ یہ سب کیوں جاننا چاہتے ہیں ــــــ اور میں بھی کتنا پاگل ہوں کہ خواہ مخواہ آپ کا دماغ چاٹنے آگیا ہوں ــــــ ہٹیے یہ اسٹول،

یہ کرسی ـــــ یہ سب ڈھکوسلہ ہے۔ بکواس۔

ڈاکٹر:۔ (ذرا سختی سے) مسٹر بلراج آہستہ بولیے۔ یہ میرا کلینک ہے، آپ شاید زیادہ بے تکلف ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔

بلراج:۔ (گھگھیا کر) نہیں ڈاکٹر صاحب! میری عادت ہے کہ میں اپنے دوستوں اور قریبی لوگوں سے ذرا اکڑ کر بات کرتا ہوں، اس لیے ـــــ میں ـــــ معاف کیجیے۔

ڈاکٹر:۔ (نرمی سے) کوئی بات نہیں ـــــ اب آپ پرسوں آئیے گا۔

(تبدیلی ماحول کا سنگیت)

دمینتی:۔ یہ کیا حال بنا لیا ہے آپ نے اپنا ـــــ نہ کھانا نہ پینا۔ مجھے خبر ہوتی کہ تم پردیس میں بھی مجھے یوں پریشان کروگے تو میں کبھی اس شہر کا رخ ہی نہ کرتی جہاں کوئی حال پوچھنے والا بھی نہیں۔

بلراج:۔ تم خود ہی آئیں۔ میں نے تو نہیں کہا تھا کہ مجھے بمبئی کی سیر کراؤ، یہ بھی بڑے بابو کی کوئی چال ہے۔

دمینتی:۔ اس نے تو اپنے جانتے اچھا ہی کیا۔ اس کے دوست کانتی لال نے اپنا مکان ہمیں دیا ہے۔ کھانے کا پورا انتظام ہے۔

بلراج:۔ ہاں، تم خوب کھاؤ، موج اڑاؤ، میں تو کل چلا جاؤں گا۔

دمینتی:۔ ایسے کیسے چلے جاؤگے۔ ابھی تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

بلراج:۔ اچھا تم مجھے اکیلے چھوڑ دو ـــــ میں کسی سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔

دمینتی:۔ کسی سے بات نہ کرو۔ مگر ڈاکٹر صاحب کے پاس تو جانا ہی ہے۔ جاؤ تیار ہو جاؤ۔

(سنگیت کی لہریں)

دمینتی:۔ نمستے ڈاکٹر صاحب۔

ڈاکٹر:۔ نمستے ـــــ کیسے ہیں بلراج صاحب۔

دمینتی:۔ کچھ گم سم ہیں۔ کھوئے کھوئے سے۔

ڈاکٹر:۔ ٹھیک ہے ـــــ آپ ان سے زیادہ باتیں نہ کیجیے، اور ان کو اندر بھیج دیجیے۔

(قدموں کی آواز ـــــ دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں)

بلراج:۔ نمستے ڈاکٹر صاحب۔

ڈاکٹر :۔ نمستے ـــــ کیسے ہیں بلراج صاحب۔

بلراج :۔ آپ کے سامنے ہوں۔

ڈاکٹر :۔ آرام سے بیٹھیے۔

بلراج :۔ (ہلکی سی ہنسی) پاؤں پھیلا کر اسٹول پر رکھ لوں۔ RELAX ہو جاؤں۔

(ریل کے گزرنے کی آواز)

بلراج :۔ (گھبرا کر) ڈاکٹر صاحب۔ ڈاکٹر صاحب۔ مجھے بچائیے۔ میں۔ میں۔

ڈاکٹر :۔ کیا ہوا۔

بلراج :۔ یہ ریل میرے اوپر سے گزر جائے۔ آپ کا کلینک بھی عجیب جگہ ہے ـــــ ریل کی پٹری کے کنارے ـــــ ڈاکٹر صاحب مجھے بچائیے۔

ڈاکٹر :۔ بلراج صاحب ـــــ بلراج صاحب! آرام سے لیٹیے (کھڑکی بند کرنے کی آواز) لیجیے میں نے کھڑکی بند کر دی۔ (ریل کی آواز دور چلی جاتی ہے) ریل گاڑی بھی دور چلی گئی۔

بلراج :۔ آپ مجھے بہکا رہے ہیں۔

ڈاکٹر :۔ (پانی گلاس میں الٹنے کی آواز) لیجیے پانی لیجیے۔

(پانی پینے کی آواز) اب آپ آرام سے لیٹ جائیے

(سکون انگیز موسیقی کی ایک لہر)

بلراج :۔ ڈاکٹر صاحب! مجھے آپ کے کلینک میں آتے ہوئے کئی ہفتے ہو گئے، اب میں آپ کو کچھ کچھ سمجھنے لگا ہوں۔

ڈاکٹر :۔ لیکن آپ کو مجھے نہیں، اپنے آپ کو سمجھنا ہے،

(پس منظر سے موسیقی ابھرتی ہے)

بلراج :۔ میں سولہ آنے سچا ہوں ـــــ اور دنیا چونی بھر بھی نہیں ـــــ چونی ـــــ چونی کا سیر بھر آٹا ـــــ اٹھنی کا آدھ سیر گھی ـــــ اٹھنی کا دھوتی کرتہ ـــــ وہ بچہ بے چارا ـــــ ایک چونی کھونے پر پیٹے جا رہا ہے۔ چٹاچٹ چٹاچٹ۔

(موسیقی کی لہر ابھر کر پھر پس منظر میں چلی جاتی ہے۔ فلیش بیک)

ماں :۔ (بچے کو چانٹے اور لاتیں مارنے اور بچے کے رونے کی آواز) کم بخت ـــــ ایک چونی کھو دی ـــــ بول ـــــ بول۔ کہاں ڈالی ـــــ کیا کھایا ـــــ کہاں چھپائی ـــــ

ارے کچھ تو بول۔

بچہ :۔ ماں ـــــ میں نے کچھ نہیں کھایا ـــــ ماں ـــــ مرا ـــــ میں ۔ مرا

ماں :۔ ابھی تو مرے گا جب چار دن کھانے کو نہیں ملے گا ـــــ بول ۔ (زور سے مارتی ہے)
آج تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گی ـــــ چھی چھی چھی ـــــ پیشاب کر دیا ـــــ
آنے دے تیرے پتا جی کو ـــــ ان سے تیری کھال نہ کھنچوادی ہو تو ـــــ اب
بھاگ رہا ہے ـــــ دیکھوں گی کہاں جائے گا۔

(بچے کے روتے ہوئے بھاگنے کی آواز دور ہوتی چلی جاتی ہے)

ماں :۔ (چیخ کر) ارے ٹھہر ـــــ کہاں بھاگ رہا ہے ـــــ ٹھہر جا۔

(بچہ کے رونے کی آواز ریل کی سیٹی میں گھل جاتی ہے اور پھر ابھر آتا ہے ریلوے اسٹیشن
کا بے ہنگم شور۔ ریل رکنے کی آواز ـــــ بھڑ بھڑ کے کی آوازیں
پھر ریل کے چلنے کی آواز اور آہستہ آہستہ اسٹیشن کی آوازیں فیڈ آؤٹ ہو جاتی
ہیں ـــــ اور ریل کے ڈبے کے مسافروں کی آوازیں ابھرتی ہیں ایک دوسرے
کو کاٹتی ہوئی آوازیں)

ایک مسافر :۔ ارے یہ کس کا بچہ ہے جو سیٹ کے نیچے سکڑا بیٹھا ہے۔

دوسرا :۔ نکالو اسے باہر۔ یہی بچے چوری کرتے ہیں۔ یہ چوروں کے گروہ کے ہیں۔

ایک مسافر :۔ کون ہے بھائی تو ـــــ

بچہ :۔ (سسکتا ہوا) میں ـــــ میں ـــــ (پھر رونے لگتا ہے)

دوسرا مسافر :۔ ٹکٹ ہے تیرے پاس۔

بچہ :۔ نہیں۔

دوسرا مسافر :۔ تو یہ گاڑی تیرے باپ کی ہے ـــــ کہاں جانا ہے۔

بچہ :۔ پتہ نہیں۔

ایک مسافر :۔ ارے چھوڑو ـــــ بیٹھا رہنے دو ـــــ ہمارا کیا لے رہا ہے۔

(لوگوں کی بول چال کی آوازیں پھر ابھرتی ہیں)

ٹکٹ چیکر :۔ ٹکٹ ـــــ آپ کا ٹکٹ ـــــ آپ کا ٹکٹ۔ ارے بچہ ـــــ تیرا ٹکٹ۔

دوسرا مسافر :۔ بابو جی یہ چوروں کے گروہ کا ہے۔ بے ٹکٹ ہے۔ اسے اگلے اسٹیشن پر اتار دیجیے۔

ٹکٹ چیکر:۔ کیوں بے —— کچھ پیسے ہیں جیب میں۔

دوسرا مسافر:۔ ہم سب کی جیبوں کے پیسے کچھ دیر میں اسی کے ہو جائیں گے۔

(لوگوں کی ہنسی)

ٹکٹ چیکر:۔ اتر جانا اگلے اسٹیشن پر —— نہیں تو پولیس کو دے دوں گا۔

(لوگوں کی بول چال کی آوازیں پھر ابھرتی ہیں —— پھر ریل گاڑی کے آہستہ ہونے اور ایک اسٹیشن پر رکنے کی آواز)

دوسرا مسافر:۔ اتر جا بے کتے کے پلے۔

بچہ :۔ (روکر) بابوجی مجھے مت اتاریے۔

دوسرا مسافر:۔ اچھا زور دکھاتا ہے —— پھینک دوں گا اٹھا کے باہر۔

بچہ :۔ بابوجی —— بابوجی ——

دوسرا مسافر:۔ ابے بابوجی کے بچّے —— چل —— (تڑاخ سے منہ پر چپت مارنے کی آواز)

بچہ :۔ ہائے ہائے۔ مرا —— (گرنے کی آواز)

پہلا مسافر: بے چارے کے خون نکل آیا —— گہری چوٹ لگ گئی۔

دوسرا مسافر:۔ گہرا ہاتھ مارتا وہ اگر میں نہ اتارتا۔

(لوگوں کی بول چال کی آوازوں پر ریل کے چل پڑنے کی آواز غالب آجاتی ہے۔ پھر ریل آہستہ آہستہ رفتار پکڑتی ہے اور آواز دور ہوتی جاتی ہے)

بچہ :۔ ہائے ہائے —— ہا ——

اسٹیشن ماسٹر:۔ (دور سے آواز) ارے کون ہائے ہائے کر رہا ہے۔ (آواز قریب آتی ہے) ارے یہ کس کا بچّہ ہے —— کون ہو بیٹا۔

بچہ :۔ (سسکیاں بھرتا ہے پھر روتا ہے) مجھے —— مجھے —— ریل سے دھکا دے دیا۔

اسٹیشن ماسٹر:۔ چہ چہ چہ —— خون بہ رہا ہے —— تیرے ساتھ تیرے ماتا پتا تھے۔

بچہ :۔ (روتے ہوئے) نہیں —— میرا کوئی نہیں۔ (پھر روتا ہے)

اسٹیشن ماسٹر:۔ دنیا بھی کتنی ظالم ہے —— ارے بلٹو! اسے ہمارے گھر پہنچا دے۔ یہ وہیں رہے گا۔

(موسیقی پھر ابھرتی ہے)

بلراج :۔ جنگل ــــ دور تک ــــ اندھیرا ــــ مجھے کچھ نہیں دکھائی دے رہا ہے ــــ میرا گھر ــــ اندھیرا ــــ اُف۔

(موسیقی ختم ہو جاتی ہے)

ڈاکٹر :۔ بس بلراج صاحب! اب آپ اٹھ جائیے۔

بلراج :۔ افوہ ــــ یہ جاگتے میں کیسے سپنے آ رہے ہیں۔

ڈاکٹر :۔ اب آپ کو کیسا لگ رہا ہے۔

بلراج :۔ کچھ طبیعت ہلکی ہے پہلے سے ــــ ڈاکٹر صاحب وہ بچہ کون ہو سکتا ہے جو بے ٹکٹ سفر کر رہا تھا۔

ڈاکٹر :۔ ہوگا کوئی ــــ اچھا اب آپ سے پرسوں ملاقات ہوگی۔

(تبدیلیٔ ماحول کا سنگیت)

مس کانچ والا :۔ خون ــــ تازہ تازہ خون ــــ دیواروں پر خون کے چھینٹے ــــ کمرے کے فرش پر خون ــــ ڈاکٹر صاحب اپن صاف بولتا ــــ پر تم کسی سے کہنا نہیں مانگتا ــــ اپنے بوائے فرینڈ کی گرل فرینڈ کا خون برابر ہم نے کرایا۔ پانچ ہزار روپیہ خرچ کیا۔ واندہ نہیں ــــ پر اب خون کے سپنے کیوں آتے ڈاکٹر صاحب۔

(دروازے پر دستک۔ پھر دروازہ کھلنے کی آواز)

بلراج :۔ (تیز آواز) کیا میں اندر آ سکتا ہوں۔

ڈاکٹر :۔ آپ ــــ آج ــــ اس وقت ــــ آپ کو تو کل گیارہ بجے آنا ہے۔

بلراج :۔ اب میں کل ول نہیں آؤں گا۔ دنیا نے مجھے بیوقوف بنایا اور آپ نے بھی۔

ڈاکٹر :۔ بلراج صاحب! آپ نہ صرف دنیا کو بیوقوف سمجھتے ہیں بلکہ تکلیف بھی پہنچاتے ہیں ــــ دنیا کو بھی اور اپنے آپ کو بھی ــــ اچھا اس وقت مہربانی کر کے جائیے ــــ میں دوسرے مریض کو ATTEND کر رہا ہوں۔

بلراج :۔ تو میں کچھ دیر باہر بیٹھ سکتا ہوں۔

ڈاکٹر :۔ مگر کیوں ــــ! میں آج آپ سے باتیں نہیں کروں گا۔

بلراج :۔ مگر میں آج فیصلہ کر کے رہوں گا ــــ آپ نے مجھے جھنجھوڑ دیا۔ آپ نے مجھے

خواہ مخواہ جھنجھوڑ دیا۔ مجھے یقین ہوگیا ہے کہ وہ بچہ میں ہی تھا جسے ریل گاڑی کے ڈبے سے دھکیلا گیا تھا۔ دیکھیے گرتے وقت جو چوٹ لگی تھی اس کا نشان موجود ہے ـــــــ اب اگر مجھے وہ اسٹیشن ماسٹر مل جائے تو میں اس کے گولی مار دوں ـــــــ ڈاکٹر صاحب! اگر وہ بچہ میں ہی ہوں تو اسٹیشن ماسٹر نے میرے ساتھ ظلم کیا۔ مجھے میرے اصل ماں باپ سے محروم کر دیا۔ میں اسے جان سے مار دوں گا۔

ڈاکٹر :۔ مگر وہ تو کبھی کے مر چکے ہوں گے۔ اب تو یہ سب لوگ آپ کے خیالوں میں زندہ ہیں، ورنہ ان کی تو راکھ بھی ختم ہو چکی ہوگی۔

بلراج :۔ تو پھر میں کون ہوں ـــــــ بلراج شرما!! نہیں نہیں۔

ڈاکٹر :۔ آپ کا سرکاری نام کیا ہے۔

بلراج :۔ بلراج شرما ـــــــ کیونکہ یہی نام شرما اسٹیشن ماسٹر صاحب نے اسکول میں لکھا دیا تھا۔

ڈاکٹر :۔ تو بس ٹھیک ہے۔

بلراج :۔ غلط ہے ـــــــ مجھے رات اچانک یاد آیا کہ میرے پتا جی کو لوگ تیاگی کہا کرتے تھے۔

ڈاکٹر :۔ اب اس بحث کو چھوڑیے ـــــــ دیکھیے شرما اور تیاگی ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آدمی کو آدمی ہونا چاہیے۔

بلراج :۔ ڈاکٹر صاحب! میرا سر چکرا رہا ہے ـــــــ میں ـــــــ میں۔

ڈاکٹر :۔ فی الحال تو آپ جائیے اور مجھے کام کرنے دیجیے۔

بلراج :۔ میں آپ کے پاس کبھی نہیں آؤں گا جب آپ میری سنتے ہی نہیں ـــــــ میں ـــــــ میں آپ کو ـــــــ

ڈاکٹر :۔ (گھنٹی بجاتا ہے ـــــــ دروازہ کھلنے اور کسی کے اندر آنے کی آواز) رام دھن! صاحب کو باہر لے جاؤ۔ باہر ان کی وائف ہوں گی۔ ذرا انھیں بلاؤ۔

بلراج :۔ جاتا ہوں ڈاکٹر صاحب! دنیا میں چونی بھر بھی مروت نہیں رہی۔

(دروازہ کھلنے، بند ہونے اور پھر کھلنے کی آواز۔ آتے جاتے قدموں کی آوازیں)

ومنیتی :۔ کہیے ڈاکٹر صاحب!

ڈاکٹر :۔ مسز بلراج! میں نے آپ کو یہ کہنے کے لیے بلایا ہے کہ بلراج صاحب بہت EXCITED ہیں۔ ان کو گھر لے جائیے۔ اور ایک دو دن ان کو گھر سے نکلنے نہ دیجیے۔

دمینتی :۔ مگر ایسا اچانک کیوں ہوا۔
ڈاکٹر :۔ ان کو اپنا اصلی گھر یاد آگیا۔
دمینتی :۔ اصلی گھر۔!!
ڈاکٹر :۔ ہاں، یہ شرما نہیں، تیاگی ہیں۔
دمینتی :۔ کیا کہہ رہے ہیں آپ ؟
ڈاکٹر :۔ وہی جو مسٹر بلراج نے مجھے بتایا ہے۔ اور جو سچ ہے، اچھا اب آپ جائیں اور ان کو پرسوں لے آئیں۔
دمینتی :۔ بہت اچھا۔ (وقت گزرنے کا تاثر سنگیت سے پیش کیا جائے)
(دروازے پر دستک اور دروازہ کھلنے کی آواز)
بلراج :۔ (فیڈان) ڈاکٹر صاحب! معاف کیجیے مجھے اس روز غصہ آگیا تھا۔
ڈاکٹر :۔ غصہ آنا بھی ضروری ہے کبھی کبھی۔
بلراج :۔ ڈاکٹر صاحب! میں نے رات ایک بھیانک خواب دیکھا۔
ڈاکٹر :۔ (ہنس کر) یہ تو اچھا ہے، بھیانک خواب کی تعبیر خوشگوار ہوتی ہے۔ آپ آرام سے لیٹ جائیے اور اطمینان سے بتلائیے کہ کیا خواب دیکھا۔
بلراج :۔ میں نے دیکھا ـــــ (پس منظر کی موسیقی فیڈان) ایک کنواں ہے ـــــ گاؤں کے بیچوں بیچ ـــــ اور پاس ہی چوپال ہے ـــــ وہاں ہے گاؤں کا چودھری ـــــ اور ایک لڑکا جس کی ناک سے خون بہ رہا ہے ـــــ اور ایک موٹی سی عورت ـــــ میں اس عورت کا گلا گھونٹ رہا ہوں ـــــ اس کی آنکھیں ـــــ ڈراونی آنکھیں نکلی جا رہی ہیں۔
ڈاکٹر :۔ وہ گاؤں کبھی آپ نے دیکھا ہے۔
بلراج :۔ شاید نہیں۔
ڈاکٹر :۔ اور گاؤں کا چودھری۔
بلراج :۔ اس چودھری کو اس سے پہلے بھی ایک دو بار خواب میں دیکھا ہے۔
ڈاکٹر :۔ کیسے۔
بلراج :۔ یہ یاد نہیں آتا۔

ڈاکٹر:۔ اور وہ موٹی سی عورت!

بلراج:۔ وہ تو کوئی بھوت ہے ——— میں نے کئی بار اس کا گلا گھونٹنے کی کوشش کی ہے۔

ڈاکٹر:۔ کہاں؟

بلراج:۔ خواب میں ——— میں ایسے ڈراؤنے خواب اکثر دیکھتا ہوں،

ڈاکٹر:۔ اچھا ذرا دماغ پر زور ڈالیے۔ آپ اس بچے کو پہچان سکتے ہیں۔

بلراج:۔ بچہ ——— بچہ ———!!

ڈاکٹر:۔ وہ بچہ آپ ہی تو نہیں۔

بلراج:۔ میں کیسے ہو سکتا ہوں ——— میں تو ادھیڑ عمر کا آدمی ہوں،

ڈاکٹر:۔ مگر کبھی تو آپ بچے تھے۔

بلراج:۔ ہاں کچھ کچھ یاد آتا ہے ——— مجھے چونیاں جمع کرنے کا شوق بچپن سے ہے ——— اسٹیشن ماسٹر کی گولک کی ساری چونیاں نکال لیا کرتا تھا ——— بڑی اچھی لگتی تھیں گول گول ——— چمکتی ہوئی ——— دنیا بھی تو گول ہے ——— یہ گول مال ہی تو زندگی ہے۔

ڈاکٹر:۔ اس بچے کو غور سے دیکھیے۔

بلراج:۔ میں ——— میں کہہ نہیں سکتا ——— شاید ———!!

ڈاکٹر:۔ شاید نہیں ——— وہ آپ ہی ہیں (موسیقی کی ایک لہر) اور چودھری صاحب آپ کے پتا ہیں اور وہ عورت آپ کی ماں۔

(موسیقی کی لہریں ابھر ابھر کر ڈوبتی ہیں جو بلراج کے ذہن کو ظاہر کرتی ہیں کہ اس پر واضح انکشاف کا کیا اثر ہوا)

بلراج:۔ کیا ———!! اگر یہ سچ ہے تو میں ان کا گلا کیوں گھونٹ رہا ہوں۔

ڈاکٹر:۔ اس لیے کہ وہ آپ کو مارتی تھیں۔ آپ خواب میں ان سے بدلہ لے رہے ہیں۔

بلراج:۔ (غیر یقینی کے انداز میں) ہو سکتا ہے ——— ہو سکتا ہے۔

ڈاکٹر:۔ بلراج صاحب! آپ کو اپنے گاؤں کا نام یاد ہے۔

بلراج:۔ نہیں ——— جانے کیسے وہ چوپال اور کنواں یاد آگیا ہے۔

ڈاکٹر:۔ تو یہ تو آپ کو یقین ہے کہ وہ چوپال اور کنواں آپ کے گاؤں کا ہی تھا۔

بلراج :۔ ہاں ـــــ اور مونچھوں والے چودھری صاحب میرے پتا۔

ڈاکٹر :۔ اچھا اب آپ اٹھیے ـــــ منہ ہاتھ دھوئیے۔ آج آپ بہت تھک گئے ہیں۔

بلراج :۔ (ہنس کر) ہاں، آج آکاش پاتال کی سیر ہوگی۔

(تبدیلیٔ ماحول کا مناسب سنگیت)

دمینتی :۔ (فیڈ ان) ڈاکٹر صاحب! یہ ہے میرا بیٹا کیلاش۔

کیلاش :۔ نمستے ڈاکٹر صاحب۔

ڈاکٹر :۔ آیئے کیلاش بابو ـــــ آپ سے ملنے سے پہلے میں آپ کے بارے میں بہت کچھ جان چکا ہوں ـــــ کچھ آپ کے دوستوں اور اس سے زیادہ بلراج صاحب کی زبانی۔

کیلاش :۔ کیا پتا جی نے میرا ذکر کیا ہے آپ سے۔

ڈاکٹر :۔ نہیں انھوں نے براہِ راست کوئی ذکر نہیں کیا ـــــ لیکن ان کے نفسیاتی تجزیہ میں آپ کا یعنی بڑے بابو کا ذکر بڑی شدّت سے آیا ـــــ مریض کی بات ہم اشاروں کنایوں میں ہی سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

کیلاش :۔ تو اب کیا حال ہے ان کا۔

ڈاکٹر :۔ میرا خیال ہے کہ اب ان کے علاج کی ایک منزل ختم ہو چکی ہے اور اب اور SITTINGS کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر اور کچھ شروع کیا گیا تو پھر دوسری پیچیدگی پیدا ہو جائے گی۔ میں نے آج آپ لوگوں کو اس لیے بلایا ہے کہ ان کے بارے میں ضروری باتیں بتلا دوں۔ مجھے امید ہے وہ آپ لوگوں کے ساتھ نارمل زندگی گزار سکیں گے۔

کیلاش :۔ پھر تو یہ میری زندگی کا سب سے شبھ دن ہوگا۔

ڈاکٹر :۔ اب جو باتیں میں آپ کو بتلانا چاہتا ہوں، وہ آپ غور سے سنیں۔

کیلاش :۔ فرمایئے۔

ڈاکٹر :۔ مسٹر بلراج اسٹیشن ماسٹر شرما جی کی اولاد نہیں، بلکہ کسی گاؤں کے چودھری تیاگی جی ان کے پتا تھے (موسیقی کی لہر)

کیلاش :۔ کیا ـــــ؟ آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا۔

ڈاکٹر :۔ انھیں کو یاد آیا۔ وہ بچپن میں گھر سے بھاگ گئے تھے۔

دمینتی :۔ اور وہ گاؤں کہاں ہے۔

ڈاکٹر :۔ تیاگی لوگوں کا گاؤں ہونا چاہیے ـــــ اور گاؤں کے بیچوں بیچ چوپال۔ اور کنواں۔

کیلاش :۔ تو گویا ہم شرما نہیں تیاگی ہیں۔

ڈاکٹر :۔ جی ہاں ـــــ اور بڑے بابو ـــــ یعنی آپ نے اپنے دفتر میں ان کی جو توہین کی ہے اس نے شاید ان کا دماغی توازن بگاڑ دیا تھا۔ الجھے ہوئے تو پہلے سے تھے اپنی ماتا جی کے برے برتاؤ اور ہر وقت مار پیٹ کی وجہ سے۔

کیلاش :۔ ڈاکٹر صاحب! بات یہ ہوئی تھی کہ ـــــ یعنی ـــــ یعنی میں نے کوئی توہین نہیں کی ہے۔ میری بدقسمتی تھی کہ جس دفتر میں پتاجی کلرک تھے میں اسی دفتر میں سیکشن افسر مقرر ہوا پتاجی پہلے تو خوش ہو کر بڑا بابو کہا کرتے تھے۔ پھر کسی بات پر مجھ سے خفا ہو گئے ـــــ اور ڈاکٹر کرونیش کے مطابق ان کا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا۔ اس کے بعد انھوں نے مجھے پہچاننا چھوڑ دیا ـــــ (جذباتی ہو کر) میں تو یہ نوکری نہ کرتا تو اچھا تھا۔ ایسی نوکری پر لعنت۔ کہ اپنے پتا سے محروم ہو گیا۔

ڈاکٹر :۔ آپ اس قدر پریشان نہ ہوں۔ اب تو وہ ٹھیک ہوئے ہیں قریب قریب۔ میں چاہتا ہوں کہ میری موجودگی میں آپ دونوں کا آمنا سامنا ہو جائے اور اس طرح ان کا غصہ نکل جائے ـــــ مسز بلراج، آپ بلراج صاحب کو اندر بھیج دیجیے۔

(دروازہ کھولنے اور جانے اور آنے کا تانتا قدموں کی آہٹ اور کرسیاں کھسکانے کی آواز)

بلراج :۔ نمستے ڈاکٹر صاحب۔

ڈاکٹر :۔ آئیے آئیے بلراج شرما صاحب۔

بلراج :۔ شرما نہیں ـــــ تیاگی کہیے ـــــ ارے بڑے بابو ـــــ! یہ آپ کے پاس کہاں سے آ گئے۔

ڈاکٹر :۔ آپ سے معافی مانگنے آئے ہیں۔

کیلاش :۔ پتاجی! میں بے حد شرمندہ ہوں کہ آپ کی شان میں گستاخی کی۔

بلراج :۔ نہیں بیٹے۔ باپ سے چپراسی کا کام لو۔ تبھی تو بڑے بابو بن سکتے ہو۔

کیلاش :۔ مجھے ایسا بڑا بابو نہیں بننا۔

بلراج :۔ میں تمھاری صورت نہیں دیکھنا چاہتا ـــــ اور میرا تمھارا کیا رشتہ۔ تم بابو کیلاش شرما۔

اور میں ـــــ بلراج تیاگی۔ تمھیں اپنی ملمع کی یہ دنیا مبارک۔ میں اپنی اصلیت کی طرف لوٹنا چاہتا ہوں۔ تم لوگ مجھے تنہا چھوڑ دو ـــــ ڈاکٹر صاحب! اس ذلیل کو آپ نے یہاں کیوں بلایا۔

ڈاکٹر:۔ یہ خود ہی آپ سے معافی مانگنے آئے ہیں۔

کیلاش:۔ پتاجی! آپ مجھے ماریں، پیٹیں، جو چاہے سزا دیں۔

بلراج:۔ (شدید غصّہ میں) میں تمھارا خون پی جاؤں گا۔ تم نے چونی چونی بھر کے لوگوں کے سامنے میری توہین کی۔ میں تمھارے ان افسروں کے سامنے ہی تمھاری کرسی پر تھوکوں گا ـــــ تم ـــــ تم وہ دن بھول گئے جب میں آدھا پیٹ کھا کر تمھیں پڑھاتا تھا ـــــ اور تم ـــــ ہٹ جاؤ میرے سامنے سے (کچھ پھینک کر مارنے کی آواز)

ڈاکٹر:۔ بلراج صاحب! یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ یہ بھی آپ کا ہی خون ہے ـــــ اب انھیں معاف کر دیجیے۔

بلراج:۔ معاف کر دوں ـــــ! یہ آپ کہہ رہے ہیں ـــــ معاف کر دوں اس بڑے بابو کو۔

ڈاکٹر:۔ جی یہ میں کہہ رہا ہوں۔ (سنگیت کی لہر)

بلراج:۔ اچھا ـــــ آپ میرے دوست ہیں، اور آپ کی بات ماننا میرا فرض ہے۔

کیلاش:۔ (روتی آواز میں) پتاجی ـــــ پتاجی!

دمینتی:۔ بچے کے سر پر ہاتھ رکھ دیجیے۔

ڈاکٹر:۔ سستا کی ماں! تم بھی یہی کہہ رہی ہو۔

دمینتی:۔ ہاں ـــــ یہ سولہ آنے ہمارا بیٹا ہے ـــــ کیلاش شرما۔

بلراج:۔ ہمارا بیٹا ہے تو کیلاش شرما نہیں۔ کیلاش تیاگی ہے۔

ڈاکٹر:۔ نام سے کیا فرق پڑتا ہے۔

کیلاش:۔ میرے اچھے پتاجی (دونوں کے گلے ملنے اور سُبکی لینے کا تاثر موسیقی کی لہر سے بھی اجاگر کیا جائے) پتاجی! مجھے دادا دادی کے پاس لے چلیے۔

ڈاکٹر:۔ کیلاش بابو! اب تو ان کی ہڈیاں راکھ ہو چکی ہوں گی۔ اب تو وہ بلراج صاحب کے خیالوں میں ہی زندہ ہیں اور ان کے روپ میں ہی اُن کے درشن کر لو۔

کیلاش:۔ مگر ہمارا گاؤں ـــــ!

ڈاکٹر :۔ کیلاش بابو ! آپ حقیقی زندگی کو اپنائیے۔ آپ کے پتا کی عمر ساٹھ سال سے زیادہ ہے۔ اب تو وہ دنیا ہی بدل گئی جس میں انھوں نے آنکھ کھولی تھی۔ اب آپ کہاں ڈھونڈیں گے اس کنویں اور چوپال کو۔ ہو سکتا ہے اب وہ گاؤں کسی شہر کا ایک حصّہ بن چکا ہو، ہو سکتا ہے گاؤں کا وہ کنواں ٹیوب ویل میں تبدیل ہو چکا ہو، چوپال کی جگہ کوئی دفتر بن گیا ہو ــــ بیتے ہوئے دن صرف یاد کرنے کے لیے ہوتے ہیں۔

کیلاش :۔ ہاں مگر کتنی سہانی یادیں ہیں۔

بلراج :۔ کم از کم ان سہانی یادوں کو تو مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا۔

ڈاکٹر :۔ ہاں ــــ لیکن موجودہ زندگی اپنے نئے تقاضوں کے ساتھ آپ کی منتظر ہے ــــ آپ کی پتنی ــــ آپ کا گھر بار ــــ پریوار۔

(پس منظر سے خوش آیند موسیقی کی لہریں ابھرتی ہیں)

بلراج :۔ یہ سب کچھ کل بھی تھا۔ مگر ایسا لگتا ہے کہ میں نے اپنے آپ کو کھو دیا تھا۔

کیلاش :۔ ڈاکٹر صاحب ! آپ کا کس زبان سے شکریہ ادا کروں کہ آپ نے ہمارے دکھی پریوار کو سکھ دیا۔

ڈاکٹر :۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ نے اپنی زندگی کو اپنا لیا۔

(ریل کے گزرنے کی آواز)

ڈاکٹر :۔ اوہ بلراج صاحب ! معاف کیجیے آج یہ کھڑکی کھلی رہ گئی۔ اور یہ ریل کی آواز آپ کو پریشان کر رہی ہوگی ــــ میں کھڑکی بند کیے دیتا ہوں۔

بلراج :۔ نہیں ڈاکٹر صاحب ! اب یہ کھڑکی کھلی رکھیے۔ ادھر سے ہی تو تازہ ہوا آ رہی ہے۔

(ریل کے گزرنے کی آواز ــــ اور یہ آواز میوزک میں تحلیل ہو جائے۔ اور زندگی اور خوشی سے بھرپور موسیقی ماحول پر چھا کر آہستہ آہستہ فیڈ آؤٹ ہو جائے۔)